فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوار ربانی	ہجرت اور سفر	مفتی محمد شفیعؒ	10
قولِ نبیؐ	نماز کے مسائل	امام ابن قیم الجوزیہ	13
خاص مضمون	خواتین کے دینی مدارس	ڈاکٹر آسیہ شبیر	16
نوائے شوق	نعت	احمد ندیم قاسمی	22
	غزل	کرامت بخاری	23
	شہدا کی ماؤں کے نام	ناصرہ عبید	23
	زندگی کو بسر آ ؤ مل کر کریں	ناصرہ عبید	24
حقیقت و افسانہ	بازی گر	قانتہ رابعہ	25
	خالی ہاتھ	فرحی نعیم	28
	مضروبہ	حبیب الرحمٰن	35
	ظالم کون	ڈاکٹر ممتاز عمر	39
سیروسیاحت	نیویارک میں چند روز	صائمہ اسما	43
گوشہِ سیرت	نبی ﷺ کی ولادت اور بچپن	آسیہ راشد	48
انشائیہ	مجھے گھر جانا ہے	ربیعہ ندرت	52
ہلکا پھلکا	ہم دعا لکھتے رہے	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	56
زندگی کا فن	سرونٹ لیڈر شپ	فریدہ خالد	58
نہاں خانہِ دل	قلمکار بہنوں سے!	افشاں نوید	62
خفتگانِ خاک	میری خالہ جان	ڈاکٹر فلزہ آفاق	64
روداد	شام افسانہ	افسانہ مہر	66
پل صراط پر	شارٹ کٹ	نصرت یوسف	68
	مرد اور عورت	فکیہہ مریم	70
حسن معاشرت	شوہر سے تعلق مضبوط بنائیں!	نور عفرا	72
محشر خیال	کرامت بخاری، قانتہ رابعہ، فرحت طاہر، مریم فاروقی، زینب وسیم، سحر شہزاد		74
بتول میگزین	فریدہ خالد، جویریہ ندیم، زینب وسیم، مریم فاروقی		78
گوشتہِ تسنیم	روزگار کی تلاش	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! آتی بہار کے نرم دنوں کی خوشگواری ایک بار پھر گرد و پیش میں پھیلی ہے۔ وہی لالہ وگل کے مناظر جو تلخیِ ایام بھلا کر سب اچھا دیکھنے اور کہنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے آنگنوں کو بسا اور چمن زاروں کو مہکتا رکھے۔ خوشیوں کے دیپ جلیں اور جلتے رہیں.... آرزوؤں، امیدوں کی فصلیں لہلہائیں اور لہلہاتی رہیں۔

یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

سب سے پہلے ایک اعتذار، کہ گزشتہ ماہ ہمارے قارئین کی ایک تعداد کو پرانا اداریہ پڑھنے کو ملا۔ کمپیوٹر نے جہاں بے حد آسانی کی ہے وہاں ایسی غلطیوں کا امکان بھی رکھا ہے جن کا صدور ہونے کا سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ بہرحال پرچہ چھپنے کے دوران جب نشاندہی ہوئی تو فوراً درستی کی گئی اور نیا اداریہ فیس بک پیج پر بھی اپ لوڈ کر دیا گیا۔ مگر جن قارئین کو ابتدا میں شائع ہونے والی کاپی موصول ہوئی انہوں نے فروری ۲۰۱۶ کی بجائے فروری ۲۰۱۵ کا اداریہ پڑھا۔ اب وہ ''گمشدہ اداریہ'' بھی آپ کے ملاحظہ کے لیے اگلے صفحات پر منسلک ہے۔ اسے باسی روٹی یا بقول قانتہ رابعہ ''ٹھنڈے پراٹھے'' کی طرح قبول کیجیے۔

یہ اور بات کہ اس غلطی پر ہمیں جتنی پریشانی، ندامت اور تکلیف ہوئی، ستم ظریفی کہیے کہ ہمارے قارئین نے اس کو بالکل قابلِ اعتنا نہ جانا۔ اسے ان کی مہربانی اور بڑاپن کہیے، یا بے نیازی اور لاتعلقی ...... جیسے فرحت نے کہا تھا کہ کوئی یہی کہہ دے کہ کیا بکواس لکھی ہے! لیکن اگر ایسا ہوتا تو فرحت کے خط کا انتا رسپانس نہ آتا۔ لہٰذا مہربانی والی بات زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اس خوش گمانی کی بنا پر ہماری جانب سے قارئین کا شکریہ بنتا ہے۔ شاید پڑھنے والوں کے اس ''ٹھنڈ پروگرام'' کی وجہ ایک عرصے سے ہمارے کم وبیش ایک ہی جیسے حالات بھی ہیں۔ ایک آدھ بڑا سانحہ، چند چھوٹے واقعات، ایک اچھی خبر، کسی وزیر سفیر کا رسمی سا بیان، بجلی پانی گیس کا رونا، مہنگائی کے دکھڑے اور بس! خیر اللہ کا شکر ہر حال میں واجب ہے، ''کوئی خبر نہ ہو تو اچھی خبر ہے'' کے مصداق، ورنہ آج اسی دنیا میں ایسے خطے بھی ہیں جن کے مقابلے میں ہمارے حالات قابلِ رشک ہیں۔ اللہ کرے ہم اور بہتری کی طرف پیش قدمی کریں اور بگاڑ کی طرف سفر کرنے سے محفوظ رہیں، اپنی توانائیوں اور وسائل کا درست استعمال سیکھیں اور اپنی کمزوریوں کو دور کریں آمین۔

گزشتہ کچھ عرصے سے نیب کی کارکردگی اور اختیارات موضوعِ بحث بنے ہوئے ہیں۔ ایک لطیفہ سنا تھا کہ پاکستان دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے کیونکہ اس کو پچھلی نصف صدی سے لوگ کھا رہے ہیں مگر یہ ختم نہیں ہوتا۔ چلیے نیب والوں کو اگر کام کرنے دیا جائے تو اچھا ہے، کہ وہ کچھ تو نکلوائیں گے..... مگر مسئلہ یہ ہے کہ کس کو پکڑیں اور کس کو چھوڑیں! حال تو یہ ہے کہ ہر کیس ایسا کہ ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست'' اور جس معاملے کو اٹھاؤ اس کے ڈانڈے ماضی و حال کے ایوان ہائے اقتدار سے جا ملتے ہیں، ہر جرم کے کُھرے محلات، حویلیوں، ڈیروں، فارم ہاؤسوں، فیکٹریوں، پلازوں اور غلام گردشوں تک پہنچ کر گم ہو جاتے ہیں۔ گویا:

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں

اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

ہرادارے کو کرپشن کی دیمک کھا گئی ہے۔ بددیانتی کی جونکوں نے خون چوس چھوڑا ہے۔ملک غریب ہے اور ایک طبقہ امیر جس کی ہوس ختم ہی نہیں ہوتی۔گزشتہ دنوں جب پی آئی اے کی ہڑتال کے دوران ہوائی سفر کا اتفاق ہؤا تو بھائیں بھائیں کرتے ایرپورٹوں کو دیکھ کر دل ہول کھانے لگا۔محدود سیٹوں کے حصول کے لیے مسافروں کی قطاریں....کنفرم ٹکٹ ہاتھ میں پکڑ کے بھی بے اعتباری سی تھی جیسے کوئی آ کے چھین لے گا۔اوپر سے ایک ہمسفر خاتون نے پہلے تو خوب غبار نکالا، پھر آستینیں چڑھا کر کہنے لگی، چار لوگوں کا بندوبست کر دیں تو یہ ملک درست ہو جائے گا۔خیر اس قصے میں بہت سی ناگفتنیاں ہیں، مگر گھوم پھر کے بات وہیں آجاتی ہے یعنی مراہؤا کتا کنویں سے نکالنے والی۔احتساب وہی کرسکتا ہے جو خود بھی اس کی زد میں آنے کے لیے تیار ہو۔اور نقطۂ آغاز بھی ڈھونڈنا پڑے گا تاکہ یہ سفر شروع تو ہو۔ابھی تو وہ حال ہے کہ بقول منیر نیازی:

منؔیر اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

اس سفر کے آغاز کے بغیر ترقی، امن، جمہوریت......سب لفظ گونگے ہیں....سب خواب اندھے اور ہر منزل کھوٹی!

تھر میں روز دس بارہ بچے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔انسانی ہمدردی کے تحت مختلف رضا کار تنظیمیں اور ادارے وہاں خوراک اور دوائیں پہنچانے اور کنویں کھدوانے میں مصروف ہیں۔الخدمت فاؤنڈیشن کا کردار سب سے نمایاں ہے۔مگر جن کی عوام ہے ان کی کارکردگی مایوس کن ہے۔یہ بے غرض لوگ جو ہر مصیبت آفت اور دکھ درد میں اپنے کاروبار، کنبے اور تفریحات چھوڑ کر اللہ کے کنبے کی خدمت کے لیے نکل پڑتے ہیں، ہمارے معاشرے میں نہ ہوتے تو انسانیت کی کھیتی کتنی ویران ہوتی۔

پنجاب اسمبلی میں منظور ہونے والی قرارداد قابلِ تحسین ہے جس میں مختلف ٹی وی چینلز پر جرائم کے واقعات کی ڈرامائی تشکیل پر مبنی پروگرام بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ایسے پروگرام سنسنی پھیلاتے ہیں، جرم کی تشہیر کرتے ہیں اور جرم کرنے کے نئے طریقے سکھاتے ہیں۔جرم کو سزا سے جوڑا نہیں جاتا اور کسی مجرم کو عبرتناک سزا ملتے ہوئے نہیں دکھائی جاتی، جس کے نتیجے میں جرم کو فروغ ملتا ہے۔ہمارا دین بھی ہمیں برائی کا چرچا کرنے سے منع کرتا ہے اور جرم کی بجائے سزا کی تشہیر کرنے کو کہتا ہے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور وہ جرم کے ارادے سے باز رہیں۔امید ہے کہ اس کے نتیجے میں ٹی وی چینلز پر اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہوگی، اگرچہ قرارداد پر اکتفا کرنے کی بجائے میڈیا کو اصول وضوابط کا پابند بنانے کے لیے ایک جامع بل لایا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

دعاؤں میں یاد رکھیے۔اگلے ماہ تک کے لیے اجازت

صائمہ اسما

الحمدللہ ماہنامہ بتول کے اجرا اور مسلسل اشاعت کو انسٹھ برس مکمل ہو رہے ہیں۔یہ پاکستان کا واحد ماہنامہ ہے جو بغیر تعطل کے نہ صرف جاری ہے بلکہ اپنی اشاعت کا دائرہ وسیع تر کر رہا ہے۔اس کامیابی کا سہرا ان سب کے سر ہے جنھوں نے اس کی ابتدا کی، پھر تاریخ کے اس سفر میں مرحلہ وار اسے آگے لے کر چلے اور مختلف پہلوؤں سے اس کی ترویج میں حصہ لیا۔اسی سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ان شاءاللہ 2 اپریل 2016 بروز ہفتہ سہ پہر 3 بجے یہ تقریب لاہور میں منعقد ہوگی۔یہ محفل بطورِ خاص بتول میں لکھنے، بتول پڑھنے اور اردو لکھنے پڑھنے سے شغف رکھنے والی خواتین کے لیے ہے، اگر آپ خود کو اس میں شامل سمجھتی ہیں تو آپ کی شرکت کا ہمیں انتظار رہے گا۔تقریب کی کنفرمیشن کے لیے، نیز اپنی آمد کی اطلاع دینے اور رجسٹریشن کروانے کے لیے ان نمبروں پر رابطہ کیجیے۔04235293624-03214025 رجسٹریشن کی آخری تاریخ 22 مارچ ہے۔

ہجرت اور سفر

سورہ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر، ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے، اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے۔) (سورہ النحل۔ آیات۔۴۱۔۴۲)

ہجرت کے لغوی معنی ترک وطن کے ہیں، ترک وطن جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ اسلام میں بڑی طاعت وعبادت ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا اَلْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو انسان نے ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔''

یہ ہجرت بعض صورتوں میں فرض و واجب اور بعض صورتوں میں مستحب وافضل ہوتی ہے، اس جگہ ان وعدوں کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے کئے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں چند شرائط کے ساتھ مہاجرین کے لئے دو عظیم الشان وعدے کئے گئے ہیں، اول تو دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دینے کا، دوسرے آخرت کے بے حساب ثواب عظیم کا، ''دنیا میں اچھا ٹھکانا'' ایک نہایت جامع لفظ ہے، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مہاجر کو سکونت کے لئے مکان اور پڑوسی اچھے ملیں، یہ بھی داخل ہے کہ اس کو رزق اچھا ملے، دشمنوں پر فتح وغلبہ نصیب ہو، عام لوگوں کی زبان پر ان کی تعریف اور بھلائی ہو، عزت وشرف ملے جو ان کے خاندان اور اولاد تک چلے (قرطبی)

آیت کا شانِ نزول اصالۃً وہ پہلی ہجرت ہے جو صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف کی، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہجرت حبشہ اور اس کے بعد کی ہجرت مدینہ منورہ دونوں اس میں داخل ہوں آیت میں یہاں انہی مہاجرین حبشہ یا مہاجرین مدینہ کا ذکر ہے، اس لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ وعدہ انہی حضرات صحابہ کے لئے تھا، جنہوں نے حبشہ کی طرف یا پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ دنیا میں پورا ہو چکا، جس کا سب نے مشاہدہ کر لیا، کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ان کا کیسا اچھا ٹھکانہ بنا دیا، ایذا دینے والے پڑوسیوں کے بجائے غمخوار، ہمدرد جاں نثار پڑوسی ملے، دشمنوں پر فتح وغلبہ نصیب ہوا، ہجرت کے تھوڑے ہی عرصہ گذرنے کے بعد ان پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے، فقراء، ومساکین مالدار ہو گئے، دنیا کے ممالک فتح ہوئے، ان کے حسن اخلاق، حسن عمل کے کارنامے رہتی دنیا تک ہر موافق ومخالف کی زبان پر ہیں، ان کو اور ان کی نسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت وشرف بخشا، یہ تو دنیا میں ہونے والی چیزیں تھیں جو ہو چکیں اور آخرت کا وعدہ پورا ہونا بھی یقینی ہے، لیکن تفسیر بحر محیط میں ابوحیان کہتے ہیں:

''اَلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا کا لفظ تمام مہاجرین عالم کے لئے عام اور شامل ہے کسی بھی خطے اور زمانے کے مہاجر ہوں، اس لئے یہ لفظ مہاجرین اولین کو بھی شامل ہے اور قیامت تک اللہ کے لئے ہر ہجرت کرنے والا اس میں داخل ہے۔''

عام تفسیری ضابطہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آیت کا شانِ نزول اگر چہ کوئی خاص واقعہ اور خاص جماعت ہو مگر اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، اس لئے اس وعدہ میں تمام دنیا کے اور ہر زمانہ کے مہاجرین بھی شامل ہیں، اور یہ دونوں وعدے تمام مہاجرین کے لئے پورا ہونا امر یقینی ہے۔

اسی طرح کا ایک وعدہ مہاجرین کے لئے سورہ نساء کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً میں وسعت مکانی اور فراخی عیش خاص طور سے موعود ہیں، مگر قرآن کریم نے ان وعدوں کے ساتھ مہاجرین کے کچھ اوصاف اور ہجرت کی کچھ شرائط بھی بیان فرمائی ہیں، اس لئے ان وعدوں کے

مستحق وہی مہاجرین ہو سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حامل ہوں اور جنہوں نے مطلوبہ شرائط پوری کردی ہوں۔

ان میں سب سے پہلی شرط توفی اللہ کی ہے، یعنی ہجرت کرنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو، اس میں دنیاوی منافع تجارت، ملازمت وغیرہ اور نفسانی فوائد پیش نظر نہ ہوں، دوسری شرط ان مہاجرین کا مظلوم ہونا، مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا وصف ابتدائی تکالیف ومصائب پر صبر اور ثابت قدم رہنا ہے اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا چوتھا وصف تمام مادی تدبیروں کا اہتمام کرتے ہوئے بھی بھروسہ صرف اللہ پر رکھنا ہے، کہ فتح و نصرت اور ہر کامیابی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مشکلات و تکالیف تو ہر کام میں ہوا ہی کرتی ہیں، ان کو عبور کرنے کے بعد بھی اگر کسی مہاجر کو اچھا ٹھکانا اور اچھے حالات نہیں ملتے تو قرآن کے وعدے میں شبہ کرنے کے بجائے اپنی نیت واخلاص اور اس حسن عمل کا جائزہ لے جس پر یہ وعدے کئے گئے ہیں تو اس کو معلوم ہوگا کہ قصور اپنا ہی تھا، کہیں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، کہیں صبر وثبات اور توکل کی کمی ہوتی ہے۔

ترکِ وطن اور ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام

امام قرطبی نے اس جگہ ہجرت اور ترک وطن کی قسمیں اور ان کے کچھ احکام پر ایک مفید مضمون تحریر فرمایا ہے، اتمامِ فائدہ کے لئے اس کو نقل کرتا ہوں قرطبی نے بحوالہ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب وجستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں اور اس کی چھ قسمیں ہیں۔

اول: یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف جانا، یہ قسم سفر عہد رسالتؐ میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرط استطاعت وقدرت فرض ہے۔ (جبکہ دارالکفر میں اپنے جان ومال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دینی فراض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دارالحرب میں مقیم رہا تو گناہگار ہوگا۔ دوسرا دارالبدعت سے نکل جانا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں، جس میں سلف صالحین پر سب وشتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر تم کسی منکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا، کیونکہ طلب حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر، یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے، تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے کیا، جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا۔ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا، فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ

پانچواں سفر آب وہوا کی خرابی اور امراض کے خطرہ سے بچنے کے لئے ہے، شریعت اسلام اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہؐ نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب وہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابو عبیدہؓ کو حکم بھیجا تھا کہ دارالخلافہ اُردن سے منتقل کر کے کسی سطح مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب وہوا خراب نہ ہو۔

لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا وبائی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں، اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں، جیسا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا، کہ سرحد شام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے، تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا، صحابہ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت

عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَّ اَنْتُمْ بِھَا فَلَا تَخْرُجُوْا مِنْھَا وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَّ لَسْتُمْ بِھَا فَلَا تَھْبِطُوْا عَلَیْھَا (رواہ الترمذی، وقال حدیث حسن صحیح)

’’جب کسی خطہ میں طاعون پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں وہاں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔‘‘

اس وقت فاروق اعظمؓ نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظن غالب ہے، وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادہ وبائی سرایت کر چکا ہے وہ تو بچے گا نہیں اور جہاں یہ جائے گا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے، اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

چھٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، جب کوئی شخص کسی مقام پر چوروں، ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرے تو وہاں سے منتقل ہو جائے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ چھ قسمیں تو اس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب وجستجو کے لئے کیا جائے اس کی نو قسمیں ہیں:

(۱) سفرِ عبرت: یعنی دنیا کی سیاحت وسفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے، قرآن کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے:

فَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

(۲) سفرِ حج: اس کا چند شرائط کے ساتھ فرض اسلامی ہونا سب کو معلوم ہے۔

(۳) سفر جہاد: اس کا فرض یا واجب یا مستحب ہونا بھی سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔

(۴) سفر معاش: جب کسی شخص کو اپنے وطن میں ضرورت کے مطابق معاشی سامان حاصل نہ ہو سکے تو اس پر لازم ہے کہ یہاں سے سفر کر کے دوسری جگہ تلاش روزگار کرے۔

(۵) سفرِ تجارت: یعنی قدر ضرورت سے زائد مال حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، یہ بھی شرعاً جائز ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ۔ ابتغاء فضل آیت میں تجارت ہے، اللہ تعالیٰ نے سفر حج میں بھی تجارت کی اجازت دی ہے، تو تجارت کے لئے ہی سفر کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوا۔

(۶) طلب علم کے لئے سفر: اس کا بقدر ضرورت دین فرض عین ہونا، اور زائد از ضرورت کا فرض کفایہ ہونا معلوم ومعروف ہے۔

(۷) کسی مقام کو مقدس اور متبرک سمجھ کر اس کی طرف سفر کرنا: یہ بجز تین مسجدوں کے درست نہیں، مسجد حرام (مکہ مکرمہ) مسجد نبویؐ (مدینہ طیبہ) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) (یہ قرطبی اور ابن عربی کی رائے ہے، دوسرے اکابر علماء سلف وخلف نے عام مقامات متبرکہ کی طرف سفر کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے، محمد شفیع۔)

(۸) اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سفر: جس کو رباط کہا جاتا ہے، احادیث کثیرہ میں اس کی بڑی فضیلت مذکور ہے۔

(۹) عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لئے سفر: حدیث میں اس کو بھی باعث اجر وثواب قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اقرباء واحباب کی ملاقات کے لئے سفر کرنے والے کے لئے فرشتوں کی دعا کا ذکر فرمایا گیا ہے (یہ جب ہو کہ ان کی ملاقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو کوئی مادی غرض نہ ہو) واللہ اعلم (قرطبی، ص ۳۴۹ تا ۳۵۱ ج ۵، سورہ نساء)

(ماخوذ از معارف القرآن)

☆......☆......☆

نماز کے مسائل

صحابہ کرام رسول اللہؐ سے مختلف موقعوں پر اپنے مسائل کے بارے میں سوالات پوچھتے تھے اور آپؐ ان کا جواب مرحمت فراتے تھے۔ یہ سوال و جواب احادیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ آپؐ کے جوابات کی حیثیت ایک طرح سے فتاویٰ جات کی ہے۔ امام ابن قیم الجوزیؒ نے ان فتاویٰ جات کو سوال و جواب کی صورت میں مختلف موضوعات کے تحت مرتب کیا ہے۔ ذیل میں نماز کے مسائل کے بارے میں آپؐ کے ارشادات درج کئے جا رہے ہیں۔

سوال: مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ثوبانؓ نے پوچھا: تمام عملوں میں سب سے زیادہ پیارا عمل اللہ کے نزدیک کون سا ہے؟

جواب: رسول اللہؐ نے فرمایا:

''تو اللہ تعالیٰ کے لئے بکثرت سجدے کرتا رہ، ہر سجدے پر اللہ تعالیٰ تیرے درجے بڑھائے گا اور تیرے گناہ معاف فرمائے گا۔''

سوال: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ دبیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا: نماز گھر میں بہتر ہے یا مسجد میں افضل؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''تم نہیں دیکھتے کہ میرا گھر سب سے زیادہ مسجد کے قریب ہے۔ مجھے گھر میں نماز پڑھنا مسجد کی نماز سے زیادہ محبوب ہے، سوائے فرض نماز کے۔''

سوال: آپؐ سے گھروں میں نماز پڑھنے کا سوال ہوتا ہے؟

جواب: فرماتے ہیں:

''اپنے گھروں کو (اللہ کے ذکر اور نماز سے) نورانی بنالیا کرو۔''

سوال: یارسول اللہ ﷺ! بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم کب کریں؟

جواب: فرمایا:

''جب وہ دائیں بائیں میں تمیز کرنے لگیں تو انہیں نماز کا حکم کرو۔''

سوال: نماز کے وقتوں کا سوال ہوتا ہے۔

جواب: آپؐ سائل سے فرماتے ہیں:

''دو دن ہمارے ساتھ نمازیں پڑھو۔''

سورج ڈھلتے ہی حضرت بلالؓ کو اذان کہنے کا حکم ہوتا ہے پھر تکبیر کہنے کا۔ پھر جب کہ سورج بہت اونچا تھا، بالکل چمکدار، پوری تیزی پر، عصر کی اقامت کا حکم ہوتا ہے۔ سورج کے غروب ہوتے ہی مغرب کی (اذان اور) اقامت کا حکم ہوتا ہے شفق کے غائب ہوتے ہی عشاء کی اقامت ہوتی ہے۔ صبح صادق کے طلوع ہوتے ہی نماز فجر کا حکم ہوتا ہے۔ دوسرے دن ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھتے ہیں، عصر کی نماز کچھ دیر کر کے پڑھتے ہیں لیکن سورج اس وقت بھی اونچا ہی تھا (بالکل بلند، واضح اور روشن)، مغرب کی نماز شفق غائب ہونے سے پہلے پڑھ لیتے ہیں، عشاء کی نماز تہائی رات گزر جانے کے بعد ادا کرتے ہیں، صبح کی نماز سویرا کر کے پڑھتے ہیں، پھر فرماتے ہیں:

''نماز کے وقتوں کا پوچھنے والا کہاں ہے؟''

اس نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ میں حاضر ہوں۔ فرمایا:

''نماز کا وقت وہ ہے جو تم نے دیکھ لیا۔''

عورت کی نماز کہاں افضل ہے؟

سوال: ایک صحابیہ آپؐ سے کہتی ہیں: میرا جی چاہتا ہے کہ آپؐ کے ساتھ نماز ادا کرتی رہوں۔

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''ہاں مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہاری چاہت میرے ساتھ نماز ادا

کرنے کی ہے۔ سنو! تمہارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا حجرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور دالان میں نماز پڑھنا محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔''

چنانچہ اس نیک بی بی نے اپنے گھر کے اندرونی انتہائی کونے میں جو سب سے کم روشنی والی جگہ تھی وہاں اپنی مسجد بنانے کا حکم دیا اور وہیں انتقال کے وقت تک نماز پڑھتی رہی۔

سوال: آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ تمام جگہوں میں بہتر جگہ کونسی ہے؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

لَااَدْرِیْ حَتّٰی اَسْأَلَ جِبْرِیْلَ

''مجھے اس کا علم نہیں جب تک کہ میں حضرت جبرئیلؑ سے پوچھ نہ لوں۔''

پھر آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: انہوں نے کہا: مجھے بھی معلوم نہیں جب تک میں حضرت میکائیل سے دریافت نہ کر لوں۔ پھر حضرت جبرئیل آئے اور فرمایا کہ:

''بہترین جگہ مسجدیں ہیں بدترین جگہ بازار ہیں۔''

سوال: نبی کریمؐ نے فرمایا کہ:

''انسان میں تین سوساٹھ جوڑ ہیں، اس پر ضروری ہے کہ ہر جوڑ پر صدقہ دے۔ تب لوگوں نے کہا: اس قدر صدقہ کرنے کی طاقت کسے ہے؟''

جواب: فرمایا:

''رینٹ یا تھوک مسجد میں دیکھ کر اسے دفن کر دینا، راستے میں سے کسی ایذا دینے والی چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اگر تو یہ بھی نہ کر پائے تو ضحیٰ کے وقت کی دو رکعت تجھے کافی ہیں۔''

سوال: یا رسول اللہؐ بیٹھ کر نماز پڑھنے کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

جواب: فرمایا:

''جو کھڑا ہو کر پڑھے وہ افضل ہے، جو بیٹھ کر پڑھے اسے آدھا اجر ہے اور جو لیٹ کر پڑھے اسے اس سے بھی آدھا اجر ہے۔''

میں کہتا ہوں اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ حکم نفل نماز کا ہے۔ یہ مطلب تو ان کے نزدیک ہے جو لیٹ کر نوافل کا پڑھنا جائز جانتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ معذور لوگوں کے لئے ہے۔ اسے اپنے فعل پر آدھا اجر ملتا ہے اور نیت پر پورا اجر ملتا ہے۔

سوال: نبیؐ سے ان امراء (حکمرانوں) کی بابت سوال ہوا جو نمازوں کو وقت سے تاخیر کر کے پڑھیں گے کہ ان کے ساتھ کیسے کیا جائے گا؟

جواب: آپ ﷺ نے فرمایا:

''نماز کو اس کے وقت پر ادا کر لو، پھر ان کے ساتھ بھی ادا کر لیا کرو، وہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔'' یہ حدیث صحیح ہے۔

سوال: حضرت صفوان بن معطل سلمی کی بیوی صاحبہؓ رسول کریمؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کرتی ہیں کہ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو وہ مجھے مارتے ہیں اور جب میں روزہ رکھتی ہوں تو وہ مجھے روزہ تڑوا دیتے ہیں اور صبح کی نماز نہیں پڑھتے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے۔ آپؐ نے سب باتیں صفوان سے دریافت کیں تو انہوں نے جواب دیا: کہ یہ دو دو سورتیں ملا کر پڑھتی ہیں جس سے میں نے انہیں منع کر رکھا ہے۔

جواب: یہ سن کر آپؐ نے فرمایا:

''اگر ایک ہی سورت ہوتی تو تمام دنیا کے لوگوں کو کافی تھی۔''

کہا: روزوں کی نسبت یہ گزارش ہے کہ یہ نفلی روزے رکھتی چلی جاتی ہیں۔ میں نوجوان آدمی ہوں کب تک صبر کرتا رہوں گا؟ اسی وقت نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

''کوئی عورت نفلی روزہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر ہرگز نہ رکھے۔''

کہا: اور میری صبح کی نماز کی تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ کام کاج والے آدمی ہیں، سورج طلوع ہو جانے تک آنکھ نہیں کھلتی، نبیؐ نے فرمایا:

''توجب جاگے نماز ادا کرلے۔''

میں کہتا ہوں چونکہ یہ کام کاج والا گھرانہ تھا اسی وجہ سے تہمت عائشہ صدیقہؓ میں ان کا نام آیا، اس لئے کہ یہ قافلے میں سب سے پیچھے تھے۔

تہجد

سوال: پوچھا گیا اے اللہ کے رسولؐ! کیا کسی وقت اللہ کی نزدیکی بہ نسبت دوسرے وقت کے زیادہ بھی ہوتی ہے؟

جواب: فرمایا:

''ہاں! اللہ تعالیٰ آدھی رات کے وقت اپنے بندوں سے بہت ہی قریب ہوتا ہے۔ پس اگر تم اس وقت ذکراللہ کر سکتے ہو تو ضرور کرلو۔''

سوال: یارسول اللہؐ صلوٰۃ وسطیٰ کونسی نماز ہے؟

جواب: ''عصر کی نماز ہے۔''

سوال: کیا دن رات میں ایسا وقت بھی ہے کہ اس وقت نماز کا پڑھنا مکروہ ہو؟

جواب: فرمایا:

''ہاں! صبح کی نماز کے بعد سے رک جاؤ جب تک سورج طلوع نہ ہو جائے۔ وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان سے طلوع ہوتا ہے۔ پھر نماز پڑھ سکتے ہو، نماز حاضر ہے اور قبولیت کے قابل ہے جب تک کہ آفتاب بیچ میں نہ آجائے۔ (دوسرا ممنوع وقت وہ ہے کہ) جب سورج تیرے سر پر آکر ایسا کھڑا ہو جائے جیسے کوئی نیزہ ہو۔ تو اس وقت بھی نماز چھوڑ دے۔ اس وقت جہنم بھڑکائی جاتی ہے، اس کے دروازے کھل جاتے ہیں، (اگر تیرا چہرہ مشرق کی طرف ہو اور) جب سورج تیرے دائیں جانب اونچا چڑھ کر ڈھل جائے تو پھر نماز حاضر اور قبول شدہ ہے، عصر کی نماز تک (تیسرا ممنوع وقت) جب عصر کی نماز پڑھ لے تو پھر سورج چھپ جانے تک نماز نہ پڑھو۔''

اس میں نماز کی ممانعت کا تعلق صبح کی نماز کے پڑھنے سے ہے نہ کہ اس کا وقت ہو جانے سے۔

ایک وتر:

سوال: رات کی تہجد کی نماز کی بابت آپؐ سے سوال کیا گیا؟

جواب: آپؐ نے جواب دیا:

''دو رکعت ہے۔ جب صبح ہو جانے کا ڈر ہو تو ایک وتر پڑھ لو۔''

سوال: حضرت ابو امامہؓ پوچھتے ہیں کہ وتر کی نماز کتنی رکعت پڑھوں؟

جواب: آپؐ جواب دیتے ہیں:

''ایک رکعت''

کہتے ہیں مجھے اس سے زیادہ کی بھی طاقت ہے۔ فرماتے ہیں:

''پھر تین رکعت، پھر فرماتے ہیں پانچ رکعت، پھر فرماتے ہیں سات رکعت۔''

ترمذی میں ہے کہ: وَالشَّفْعِ والوتر (الفجر) کی بابت آپؐ سے سوال ہوا تو آپؐ نے جواب دیا کہ اس سے مراد:

''جفت اور طاق رکعت کی نماز ہے۔''

سنن دارقطنی میں ہے کہ ایک صاحب نے آپؐ سے وتر کی بابت پوچھا تو آپؐ نے تین وتروں کی نسبت فرمایا:

''دو پڑھ کر سلام پھیر کر پھر ایک پڑھو۔''

سوال: یارسول اللہؐ افضل نماز کونسی ہے؟

جواب فرمایا: ''جس کا قیام لمبا ہو۔''

سوال: پوچھا گیا کہ رات کے کس وقت تہجد پڑھنا افضل ہے؟

جواب فرمایا:

''آدھی رات کو اور اس کے عامل بہت کم ہیں۔''

سوال نسائی شریف میں ہے کہ آپؐ سے دریافت کیا گیا: کیا کوئی ساعت بہ نسبت دوسری ساعت کے اللہ سے زیادہ قریب کرنے والی بھی ہے؟

جواب: فرمایا: ہاں درمیان آدھی رات کا وقت۔

(ماخوذ از فتاویٰ رسول اللہؐ)

نوٹ: جو احادیث بیان کی گئی ہیں ان سب کے حوالے اس کتاب میں موجود ہیں۔

☆......☆......☆

☆ڈاکٹر آسیہ شبیر

خواتین کے دینی مدارس اور ہماری معاشرتی ضروریات

علم، انسانیت کے لیے تحفہء ربانی ہے۔(**اقرا و ربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم**)[1] یہی دیگر مخلوقات پر اس کی وجہ فضیلت ہے۔ مذاہب عالم اور تہذیب انسانی کی تاریخ میں یہ بلند پایہ اعزاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ علم اور اس کی تعبیر و تشریح نہ تو یونانیوں کی طرح کسی طبقے کی میراث رہی مثلاً اشرافیہ، نہ اس پر کسی نسلی گروہ کا اجارہ قائم ہوا جیسے برہمن اور بنی لاوی اور نہ کلیسا کی انجمن (church council) اور پاپائیت جیسا ادارہ یہاں پنپ سکا۔[2] اقرأ کے اولین پیغام کے ساتھ ہدایت الٰہی کے جس آخری اور تکمیلی منصوبہء عمل کا آغاز ہوا، اس میں علم کا سحاب رحمت کمزوروں، غلاموں، مردوں اور عورتوں، عرب اور عجم پر یکساں برسا۔ وہ طبقات، جو انسانی تاریخ میں ہمیشہ پس ماندہ رکھے گئے تھے، انھیں جب اپنی صلاحیتوں کے آزادانہ اظہار کا موقع ملا تو تاریخ کے صفحات پر کتنے ہی کارہائے نمایاں ثبت کر گئے۔ علم کے ہر شعبے میں غلاموں نے وہ کمال پایا کہ اس حوالے سے دریافت کرتے کرتے ایک اموی خلیفہ چلّا اٹھا، کہ کیا عرب ماؤں نے اہل علم جننے بند کر دیے ہیں۔[3]

غلاموں کے علاوہ طبقہء نسواں بھی اس حوالے سے بڑا نمایاں ہوا۔ خواتین بڑی تیزی سے علمی میدان میں آگے بڑھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ حوصلہ دیا کہ وہ اپنی جداگانہ حیثیت کی مالکہ ہیں اور طلبِ علم کا ویسا ہی حق رکھتی ہیں جیسا کہ مرد۔[4] یہی وجہ ہے کہ جمعہ وعیدین کے خطابات سننے اور مسجد کی نمازوں میں شرکت کرنے کے علاوہ بھی ان کی حصول علم کی کاوشوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ وہ مردوں کے دروس کی سامع ہوتیں۔ خود اپنے حلقہ ہائے درس قائم کرتیں جن میں صرف خواتین شریک ہوتیں اور بعض اوقات مرد بھی ان کے مستقل شاگرد ہوتے یا کسی خاص معاملے میں ان سے استفسارات کرتے اور حتیٰ کہ فتویٰ طلب کرتے۔[5]

امہات المومنین نسائی علمی تحریک کی قائد تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات، معاشرت، عائلی زندگی، باہمی تعلقات اور اخلاق و آداب کے بارے میں معلومات کا بڑا حصہ ان بلند مرتبہ خواتین کے واسطے سے امت کو ملا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں مشہور گواہی دی تھی کہ **کان خلقه القرآن**[6] اس کے علاوہ بھی عالمِ نسواں کے خصوصی مسائل اور ان کی جذباتی کشمکش میں توازن قائم کرنے کے حوالے سے بعض بڑے اہم سبق انہیں جلیل القدر خواتین سے روایت ہوئے۔ امہات المومنین صرف کثرت سے روایت کرنے والوں ہی میں شامل نہیں، بلکہ انھوں نے خواتین کے علاوہ مردوں کے لیے بھی تفقہ اور تدبر کی مثالیں قائم کیں۔[7] دنیا کی مذہبی روایت کا سرسری مطالعہ رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ یہاں بس "روایات" کافی سمجھی جاتی ہیں۔ کسی روایت کی "معقولیت" کا سوال مذہبی ادب کی تاریخ میں کم ہی اٹھایا گیا لیکن امہات المومنین کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کی روایت کو قبول نہیں کیا جب انھوں نے یہ فرمایا کہ میت پر بین کرنے سے مرنے والے کو عذاب ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ غلط بیان کرتے ہیں نہ اپنے پاس سے گھڑتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ سماعت بھی تو خطا کر سکتی ہے۔ اس روایت کے معنی کھول کر بتائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ اس مرنے والی کو عذاب ہو رہا ہے اور اس کے گھر والے اس کے دنیا سے رخصت ہونے پر رو رہے ہیں۔[8]

مسلم تاریخ کے بعد کے ادوار میں بھی خواتین کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ وہ مفسرات اور محدثات تھیں۔ فقہ اور اصول فقہ کی ماہر تھیں۔ شاعری، ادب، تاریخ اور طب، ہر میدان میں انھوں نے اپنی مہارت کے جھنڈے گاڑے۔ مکہ ومدینہ ہو یا شام اور کوفہ، بغداد اور اندلس ہوں یا برّصغیر، مسلم خواتین کی علمی تگ وتاز ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔

پاکستان میں خواتین کے دینی مدارس

برّصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کے عرصہء حکمرانی کے دوران خواتین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا لیکن خواتین کے علیحدہ مدارس یا اقامتی مدارس کم از کم اس خطے میں بہت پرانی روایت نہیں رکھتے۔ مردوں کے لیے ایسے قدیم مدارس بھی بہت تھے اور بعد میں اصلاحات اور ترامیم کے ساتھ بھی بہت سے مدارس نے فروغ پایا مثلاً دیوبند، ندوۃ العلماء، مدرسہ الاصلاح وغیرہ۔ اگرچہ خواتین کے لیے سکول اور کالج انگریزوں کے دور میں شروع ہو گئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی تسلسل سے قائم ہوتے گئے لیکن اقامتی دینی مدارس بہت بعد میں بننا شروع ہوئے۔ 1980 کی دہائی میں خواتین کے دینی مدارس کے قیام کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اور اگلی دو دہائیوں میں اس سلسلے میں بہت تیزی دیکھنے میں آئی۔ مدارس کے وفاق بنے، رجسٹریشن اور باقاعدہ ڈگریوں کا نظام بنا۔

پاکستان میں دینی مدارس کے پانچ وفاق (boards) ہیں جن سے سینکڑوں مردانہ وزنانہ مدارس منسلک ہیں۔ وفاق المدارس السّلفیہ اہلحدیث مدارس کا وفاق ہے۔ وفاق المدارس العربیہ اور تنظیم المدارس بالترتیب دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کے نمائندہ ہیں۔ وفاق المدارس الشیعہ اہل تشیع مدارس کا بورڈ ہے۔ رابطۃ المدارس الاسلامیہ جماعت اسلامی کا نمائندہ وفاق ہے جو مسلکی تفریق کے بغیر قائم کیا گیا ہے۔ 2014 میں کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق ان تمام وفاقوں سے وابستہ رجسٹرڈ مدارس طالبات کی تعداد 7654 ہے۔[9] ہزاروں بچیاں یہاں حفظ، ناظرہ اور مختلف درجات کی دینی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ مدارس میں صرف غریب بچیوں کے علاوہ اب آسودہ حال گھرانوں کی بچیاں بھی تعلیم حاصل کرتی ہیں گو کہ ان کی تعداد دس سے بیس فیصد کے درمیان ہے۔[10]

دینی مدارس کی خدمات

دینی مدارس بچوں کے ہوں یا بچیوں کے، برصغیر کے خصوصی تناظر میں ہر محبّ وطن اور محبّ دین انھیں ''اسلام کا قلعہ کہتا ہے۔'' اس ''خطاب'' کی ایک تاریخ ہے۔ برصغیر پر انگریزوں کے قبضے کے بعد، جب مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت نکل گئی تو یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ مسلمان، ہندوستان میں ہمیشہ سے اقلیت تھے۔ سلطنت اور حکومت کی قوت ان کے لیے دینی، سیاسی اور معاشرتی ہر اعتبار سے مضبوط ڈھال تھی۔ برطانوی راج میں عربی وفارسی کی تعلیم کے لیے صرف سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہی بند نہیں کیے گئے بلکہ وہ بڑے بڑے اوقاف، جن پر مدارس کی زندگی کا دارومدار تھا، مختلف حیلوں بہانوں سے ضبط کر لئے گئے۔[11] ان حالات میں اس بات کا امکان موجود تھا کہ یہاں کے مسلمانوں کا انجام سپین کے مسلمانوں جیسا ہو جہاں سلطنت وحکومت کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کا بھی صفایا کر دیا گیا تھا۔ اس اندیشے کا اظہار شاہ ولی اللہ (1762-1703) نے اپنے زمانے میں ہی کر دیا تھا جن کی وفات کے تین سال بعد بنگال پر قبضے سے انگریزوں نے اپنی فتوحات ہند کا آغاز کیا تھا۔[12]

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی برصغیر میں مدارس کی تاریخ کا ایک اہم موڑ (turningpoint) تھا۔ پورا برصغیر اس استعماری طاقت کی غلامی میں چلا گیا تھا جس کے اولین حریف مسلمان تھے۔ ایسے میں کچھ پرعزم لوگ اٹھے۔ عوام الناس کی مدد سے انھوں نے اسباب ووسائل کی کم یابی کے باوجود اس خطے کی مسجدوں کو آباد اور نئی نسلوں کو قرآن وحدیث اور تعلیماتِ دین سے وابستہ رکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ بقول ایک مؤرخ ان کوششوں کی وجہ سے استعماریت کے اس ''سیلاب بلا میں جہاں سب کچھ بہہ گیا وہاں کم از کم تسبیح سجدہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ قوم کا دینی انحطاط نہ شروع ہو گیا''۔[13]

قیام پاکستان کے بعد بھی مدارس سرکاری سرپرستی سے عام طور پر

محروم ہی رہے لیکن اس کے باوجود یہ قافلہ سخت جاں نہ صرف اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہے بلکہ اپنے "متعین کردہ" اہداف ومقاصد کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

2۔غیرسرکاری رفاہی تنظیم

مدارسِ دینیہ کو پاکستان میں سب سے بڑی NGO بھی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ ملک جس کی %60.19 آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کررہی ہو۔[۱۴] اور بچوں کی خوراک اور دواؤں کی ضرورت بھی پوری نہ کرسکتی ہو، وہاں بچیوں کی تعلیم کا سوچنا اور اہتمام کرنا دور کی بات ہے۔ ان دینی مدارس کا فیضان ہے کہ ہزاروں مستحق بچیاں یہاں اقامت پذیر ہوتی ہیں اور ان کے کھانے پینے ،لباس اور رہائش کی فراہمی کی ذمہ داری مدارس اٹھاتے ہیں۔اسی طرح پاکستان میں بے روزگاری کی شرح 15-2014 کے اکنامک سروے آف پاکستان کے مطابق %6 ہے۔[۱۵] ان مدارس میں اساتذہ ، منتظمین اور ورکرز کی صورت میں سینکڑوں لوگ کسی نہ کسی درجے کے روزگار سے وابستہ ہوجاتے ہیں اور یوں بے روزگاری کی شرح کم کرنے میں بھی یہ مدارس مددگار ہیں۔

3۔دینی تربیت

ان مدارس میں، خاص طور پر اقامتی ماحول میں زندگی کا کچھ حصہ گزارنے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ زندگی بھر اس کے اثرات باقی رہتے ہیں شعائر اسلامی کے احترام اور فرائض دینی کی پاسداری کے اہتمام کا احساس دیگر اداروں سے وابستہ بچوں کی نسبت مقابلتاً زیادہ ہوتا ہے۔

4۔تبلیغ دین

ہمارے عوام عام طور پر دینی علوم کے حاملین پر شرعی وفقہی مسائل میں اعتماد کرتے ہیں۔مدارس سے فارغ التحصیل مرد حضرات مساجد ومدارس کا انتظام سنبھال لیتے ہیں اور خواتین عام طور پر اپنے گھروں میں دعوتی مرکز قائم کرتی ہیں یا کسی دینی مدرسے سے وابستہ ہوجاتی ہیں۔وہ بچیاں، جو یہاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، ان کے گھروں کی دیگر خواتین بھی ان مدارس سے تعلق رکھتی ہیں اور دروسِ قرآن اور مدرسے کی دیگر تقریبات میں شریک ہوتی رہتی ہیں یوں مدارس کا ایک معاشرتی دائرہ (social circle) تشکیل پا جاتا ہے۔

5۔دنیاوی تعلیم

اکثر مدارس میں میٹرک ،ایف اے ،بی اے وغیرہ کی تعلیم کا انتظام بھی ہونے لگا ہے۔طالبات عربی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ لازمی مضامین، انگریزی ،مطالعہ پاکستان اور اردو وغیرہ کے ساتھ عربی اسلامیات کا امتحان دے لیتی ہیں اور اس سے ان کے قومی دھارے میں آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

دینی مدارس کا معاشرتی کردار توجہ طلب پہلو

خواتین کے دینی مدارس کی ان ساری خدمات کے باوجود بہت سے پہلو ایسے ہیں جو فوری توجہ اور بنیادی اصلاحات کے متقاضی ہیں تاہم درج ذیل مطالعے (study) میں صرف معاشرتی مسائل اور ضروریات کے حوالے سے تحقیق کی کوشش کی گئی ہے۔

مدارسِ خواتین کے اس خصوصی مطالعے کے لیے حاصل کی جانے والی معلومات (data) کے مطابق یہاں سے گزشتہ سالوں میں فارغ التحصیل طالبات کی تعداد لاکھوں میں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تعداد میں اکثریت ان طالبات کی ہے جو یہاں جزوقتی ناظرہ قرآن کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ باقاعدہ تعلیم ان کی سکولوں میں ہوتی ہے۔ پھر بھی مدارس کی اقامتی اور خالص دینی تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کی تعداد بھی سالانہ ہزاروں میں ہے۔[۱۶] مدارس کی فارغ التحصیل علم دین کی حامل خواتین کی اس تعداد کو دیکھا جائے اور پاکستانی معاشرے کی دینی حالت کو۔۔۔تو ان خواتین کا معاشرے میں متحرک اور جاندار کردار دکھائی نہیں دیتا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ:

☆علوم نبوت کی وارث یہ خواتین معاشرے میں قائدانہ کردار ادا کرتیں۔

☆ معاشرتی اعتبار سے، علم وفہم اور تدبر کے اعتبار سے ان کا مقام نمایاں ہوتا۔ان کی فکر ودانش سے استفادے کی ضرورت محسوس کی جاتی

اورانھیں نظرانداز کرنا ممکن نہ ہوتا۔

☆فیصلہ سازی کے عمل میں ہر سطح پر ان کی رائے کواہمیت دی جاتی۔

☆معاشرتی رجحانات کی تشکیل (trend setting) میں ان کا حصہ ہوتا۔

☆ گھریلو اورمعاشرتی زندگی میں مدارس کی فارغ التحصیل طالبات کے کرداراورعمل سے متاثر ہوکراورلوگ بھی دینی تعلیم کی طرف راغب ہوتے۔اس کے نتیجے میں یا تو مدارس کی شرح داخلہ کئی گنا بڑھ جاتی یا عوام حکومت پرزور دیتے کہ عمومی تعلیمی نصابات میں دینی تعلیم کا حصہ بڑھایا جائے کیونکہ اس کے نتائج عام دنیاوی تعلیم سے کئی گنا بہتر ہیں۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ایک طرف دین کی غربت واجنبیت کے لیے حدیث نبویؐ کی پیشن گوئی ہے۔**بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا کما بدأ** دوسری طرف عالمگیریت globalization کے دور کے اپنے سے فتنے ہیں۔سیکولر فکر کی پذیرائی، لادینی نظریات کی یلغار،میڈیا کے ذریعے دجالی (دجل وفریب پر مبنی) پراپیگنڈہ ،اسلامی شعائر ،حتیٰ کہ کتاب رسول اور بنیادی عقائد تک نشانے پر ہیں۔اسلامی معاشرے،ان کے نوجوان طبقات اورخواتین خاص طور پر اس تہذیبی یلغار کاہدف ہیں۔مشہور انگریزی کہاوت کے مطابق فوجوں کی یلغار تو روکی جاسکتی ہے،افکارونظریات کی یلغار کونہیں روکا جاسکتا۔

(An invasion of armies can be resisted but an invasion of ideas cannot be resisted.)

ہماری معاشرت، اقدار، ثقافت، روایات، باہمی تعلقات اور حقوق وفرائض کے سارے تصورات،حقیقی دینی تعلیمات سے دن بدن دور ہوتے جارہے ہیں۔یہ وقت کے معاشرتی چیلنج ہیں۔دوسری طرف دیکھا جائے تو 90% مدارس نے اس قسم کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہی نہیں ہے۔(14 مدارس سے بروشر لیے گئے تھے) کسی ایک مدرسے نے بھی اپنے فکری وعملی مقاصد (vision or mission) میں یہ نہیں لکھا کہ آج تہذیبی چیلنج کے مقابلے کے لیے نئی نسلوں کی تیاری ان کا مطمح نظر ہے۔یہی وجہ ہے کہ جو فصل (product) ان مدارس سے برآمد ہورہی ہے،اپنے اردگرد کی دنیا سے نہ صرف آگاہ نہیں ہے بلکہ ایک درجہ بیگانہ وبے نیاز ہے۔

ہماری معاشرتی ضروریات اورتقاضے،دینی مدارس کے مطلوب کردار،اورموجودہ عملی صورتِ حال کو جانچنے کیلئے زیرِ نظر تحقیق (study) چند براہ راست جائزوں کی مدد سے کی گئی۔

☆مدارس کی فارغ التحصیل 10 طالبات سے ان کی آراء لی گئیں۔ (انٹرویو اور بالمشافہ گفتگو کے ذریعے سے)

☆ ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مدارس کی مہتممات اور اساتذہ سے سروے کروایا گیا (تقریباً 25 خواتین) تاکہ معلوم ہو سکے کہ کیا ان کی ترجیحات میں یہ بات موجود ہے کہ ان کی فارغ التحصیل طالبات معاشرے میں دین کی اجنبیت دور کرنے اور دینی اقدار کے فروغ کا باعث بنیں۔اورکیا اساتذہ میں طالبات کے اندر قائدانہ کردار ادا کرنے کی سپرٹ (spirit) پیدا کرنے پر توجہ ہے؟

☆انہیں نکات کے تحت بعض مدارس میں خود جا کر،اور ان کی اہم اساتذہ سے ملاقاتیں کرکے اوران کی سالانہ تقریبات میں شرکت کر کے براہ راست مشاہدات اورگفتگو سے نتائج اخذ کئے گئے۔واضح رہے کہ ان خواتین کو مطلع نہیں کیا گیا کہ آنے کا مقصد کیا ہے۔

☆ان خواتین سے آراء لی گئی جو مدارس کی فارغ التحصیل خواتین کے قائم کردہ حلقہ ہائے درس میں شرکت کرتی ہیں۔(100 خواتین سے سروے)یوں quantitativeاور qualitative ریسرچ میتھوڈولوجی استعمال کرتے ہوئے مندرجہ بالا چاروں ذرائع سے جو مسائل سامنے آئے،اور جن کے بارے میں محسوس ہوا کہ عصرِ حاضر کے مطلوب کردار کو پیدا کرنے میں بڑی رکاوٹ ہیں،ان میں سے بعض اہم نکات ہم یہاں درج کررہے ہیں۔

1۔مسلکی آراء کی مرکزی حیثیت

خواتین کے مدارس کی عالمات تیار کرنے کی کلاسوں کے لیے

ہاسٹل میں قیام لازم شرط ہے۔(جیسا کہ بروشرز سے ظاہر ہوا) یہ بات ذہن میں رہے کہ ہمارے 90% مدارس مسلکی بنیادوں پر قائم شدہ ہیں (پانچ میں سے چار مسلکی بنیادوں سے وابستہ)۔طالبات وہیں پڑھتی اور مقیم رہتی ہیں۔جو فقہی آراء انھیں پڑھائی جاتی ہیں، اپنے اس محدود ماحول میں وہ انھیں پر سو فیصد عمل ہوتا دیکھتی ہیں۔دو چار سال مدرسے میں قیام کے عرصے میں وہ اس ماحول کی اتنی عادی ہو جاتی ہیں کہ عام طور پر کسی دوسرے نقطہءنظر یا طریقہءعمل کو قابل اعتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں۔جبکہ معاشرے میں، جہاں باہر نکل کر انھیں پبلک کو مخاطب کرنا ہے، وہاں سب مسالک کے لوگ ملے جلے رہتے ہیں۔جمہور علمائے امت کی رائے کو بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے عامۃ الناس کے لیے چاروں فقہی مسالک میں سے کسی ایک کی پیروی اختیار کرنے کو عین صواب قرار دیا ہے ۱۸ اور پاکستانی معاشرے کا عمومی طرز عمل بھی یہی ہے۔

ہمارے مدارس کا بہت بڑا المیہ ہے کہ یوں تو وحدتِ امت کے پرچار سے زبانیں نہیں تھکتیں لیکن مسلکی تعصّبات کا معاملات پر اثر بڑا واضح اور نمایاں ہے۔کل پانچ اور صرف اہل سنت کے چار وفاق خود اس تفریق کی گواہی دیتے ہیں۔خود اہل مدرسہ اس معاملے کو چھپانے کی بھی بہت کوشش نہیں کرتے۔مثلاً مسلکی معاملات پر اظہار خیال کرنے کے حوالے سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں ایک سینئر اساتذہ نے لکھا کہ مسلکی غیرت بعض اوقات ''اظہارِ حق'' کا تقاضا کرتی ہے۔ایک مدرسے کی انتظامیہ نے سروے میں اپنی طالبات کی معاشرتی خدمات کے بارے میں سوال پر ایک ہی نکتہ بیان کیا ''ہماری طالبات نے فلاں فلاں شہر میں......(مسلک کا نام لکھا تھا) کے خلاف جہاد کیا۔'' مدارس کی طالبات سے جو آراء لی گئیں ان کے مطابق مدرسات ناظرہ پڑھنے کے لیے آنے والی جز وقتی طالبات پر بھی مسلکی حوالوں سے طنز سے باز نہیں رہتیں۔فارغ التحصیل طالبات اپنے قیام مدرسہ کے عرصے میں اس طرزِ عمل کی اتنی عادی ہو جاتی ہیں کہ بعد ازاں ان حوالوں سے کسی تلخ تبصرے سے اپنے آپ کو روک نہیں پاتیں۔

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ عام لوگوں کی اکثریت نماز کی پابند نہیں ہے۔انھیں وضو اور غسل کے فرائض تک کی واقفیت نہیں ہے۔ طالبات کے کالجوں میں روزہ رکھنے والی طالبات کم نظر آتی ہیں۔ زکوٰۃ کے بارے میں یونیورسٹی کی 40 طالبات کی ایک کلاس میں پوچھا گیا اور بچیاں گھروں سے پتہ کر کے آئیں۔معلوم ہوا پانچ سات گھرانوں کو نصاب کا علم تھا اور حساب کر کے زکوٰۃ نکالنے کا۔باقی لوگوں کو شرح زکوٰۃ تک معلوم نہیں تھی۔اب یہ عجیب نہیں کہ ان کی اساتذہ محلے کے درسِ قرآن یا قرآن کلاس میں انھیں رفع الیدین کی فضیلت اور عدم فضیلت یا وتر پڑھنے کے طریقوں میں سے افضل اور مفضول سکھانے پر مصر ہیں حالانکہ یہ معاملات ہر دو طرح سے نبی کریمؐ کی سنتِ ثابتہ ہیں۔

(جاری ہے)

مصادر و مراجع

۱۔سورۃ العلق ۹۶:۳۔۵

۲۔ i۔یونانیوں میں افلاطون، سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔اس نے ایک مثالی ریاست کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس میں تعلیم و تعلم صرف حکما، اور اعلیٰ فوجی قیادت کے لئے ضروری ہے۔ریاست کے باقی باشندوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے (ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ، اردو بازار لاہور ۱۹۸۱ء)

ii۔ہندوؤں کے مطابق برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوئے تھے، اس لئے ویدوں کا سیکھنا، سمجھنا، پڑھنا پڑھانا بس انہی کی ذمہ داری ہے۔ منو دھرم شاستر، ترجمہ ارشد رازی، ص ۳۷، نگار شات پبلشرز، لاہور ۲۰۰۷

iii۔بنی لاوی حکم تورات کے مطابق منصب کہانت پر فائز تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کے دینی اور علمی مقام کے بارے میں، جو انہیں یہود میں حاصل تھا، بڑی دلچسپ معلومات، عہد نامہ قدیم سے اخذ کر کے لکھی ہیں۔خیمہٗ عبادت میں صرف بنی لاوی داخل ہو سکتے تھے۔یہود کو جس معاملے میں مشکل پیش آتی، کاہن اعظم تابوت کے

پاس جا کر خدا کے فیصلے معلوم کر لیتا ۔ مجرد تابوت کے سامنے حاضری حصول الہام کے لئے کافی تھی ۔ یہ کاہن معصوم اور ملہم خیال کئے جاتے ۔ اس طریقے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنی لاوی '' **اربابا من دون اللہ**'' بن بیٹھے اوران کے ہر قسم کے اوہام اور خیالات نے قانون کا درجہ حاصل کر لیا ۔ (امین احسن اصلاحی ، حقیقت شرک ، ص ۶۷، مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۸۰)

۳۔ تدوین حدیث، سید مناظر احسن گیلانی ، ۲۱۵ تا ۲۲۵، مکتبہ العلم، اردو بازار لاہور۔

۴۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل ، کتاب العلم، **باب ھل یجعل للنساء یوما** حدیث/دار السلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۹ء

۵۔ الطبقات الکبریٰ، محمد بن سعد بن منیع ، ۷/۹۶۲ ۔ ۳۱۷، دار الاحیاء، الراث الغربی، بیروت ۔ لبنان۔

۶۔ صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب صلاۃ المسافرین ۔ باب جامع صلاۃ اللیل ۔ حدیث ۷۳۹ ادار السلام للنشر التوزیع ریاض ۲۰۰۰۔

۷۔ صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا ، باب اثبات الحساب، حدیث ۷۲۲۵، ۷۲۲۷۔

۸۔ صحیح بخاری، حدیث ۱۲۸۶

۹۔ خواتین کے دینی مدارس کا قومی ترقی میں کردار، نورین خالدہ ، (تحقیقی مقالہ ایم فل ۔ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی)۲۰۱۴، ص ۳۶

۱۰۔ ایضاً ص ۴۶

۱۱۔ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، ص ۱۶۷، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ۔ کراچی یونیورسٹی، کراچی ۱۹۹۹ء

۱۲۔ شاہ ولی اللہ نے نجیب الدولہ کے نام اپنے مکتوب میں لکھا '' اگر غلبہء کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی۔'' شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، خلیق احمد نظامی، ص ۲۳، ۲۲، اردو بازار لاہور۔ ۱۹۷۸ء

۱۳۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۵۳۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۷

14- http?www.dailytimes.com.pk/business/03-jun-2014/earnin -2-a-day-60-19 population-live -below-poverty-line

15- pakistan economic survey 2014-15 economics and social indecators hhtp; www finance.gov.pk/ survey/ chapters15/ economic indicators pdf retrived06-august2015

۱۶۔ دینی مدارس میں تعلیم ۔ کیفیت، مسائل، امکانات، سلیم منصور خالد، ص ۱۶۳، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد ۔ ۲۰۰۲ء

۱۷۔ صحیح مسلم، باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا، حدیث ۳۸۴

۱۸۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید شاہ ولی اللہ، ص ۱۰۱، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد ۔ ۲۰۰۰ء

☆......☆......☆

نعت

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

تہ بہ تہ تیرگیاں ذہن پہ جب ٹوٹتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیرا

کچھ نہیں سوجھتا جب پیاس کی شدت سے مجھے
چھلک اٹھتا ہے مری روح میں مینا تیرا

پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

دستگیری مری تنہائی کی ، تو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترے پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

تو بشر بھی ہے مگر فخرِ بشر بھی تو ہے
مجھ کو تو یاد ہے بس اتنا سراپا تیرا

وہ اندھیروں سے بھی درّانہ گزر جاتے ہیں
جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا تیرا

ندّیاں بن کے پہاڑوں میں تو سب گھومتے ہیں
ریگزاروں میں بھی بہتا رہا دریا تیرا

شرق اورغرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں میں
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تاحشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا

احمد ندیم قاسمی

غزل

حادثے حق کی حمایت نہیں کرنے دیتے
یعنی کچھ لوگ عبادت نہیں کرنے دیتے

کیا قیامت ہے کہ اب تو مری سرکار کے لوگ
مجھ کو نفرت سے بھی نفرت نہیں کرنے دیتے

تشنگی حد سے بڑھی جاتی ہے اہلِ دل کی
پھر بھی ساقی کی شکایت نہیں کرنے دیتے

اب تو حالِ دلِ بیمار خدا ہی جانے
چارہ گر اس کی عیادت نہیں کرنے دیتے

دور سے دیکھتی رہتی ہے وہ دزدیدہ نظر
مجھ کو حالات زیارت نہیں کرنے دیتے

مصلحت عقل سے کہتی ہے کہ خاموش رہو
اب تو نادار کی نصرت نہیں کرنے دیتے

باکرامتؔ ہیں یہ تخلیق کے لمحے لیکن
مجھ کو مجھ سے بھی رعایت نہیں کرنے دیتے

کرامتؔ بخاری

سانحۂ پشاور اور چارسدہ کے
شہدا کی ماؤں کے نام

جس دن بیٹا کھویا تھا
تڑپا تھا دل ، رویا تھا

میرے پیارے لختِ جگر نے
خون سے چہرہ دھویا تھا

اس کی خاطر ارمانوں کا
میں نے ہار پرویا تھا

میری دنیا ڈوب گئی تھی
وہ تو چین سے سویا تھا

چند آنسو پلکوں پہ رکے تھے
موت سے پہلے رویا تھا

اس دن جب میرے اشکوں نے
میرا دامن دھویا تھا

اس دن دل میں درد کا دکھ کا
بیج کسی نے بویا تھا

ناصرہ عبید

زندگی کو بسر آؤ مل کر کریں

سایۂ دین میں اب پنہ لیجئے
اپنی اقدار سے جی لگا لیجئے

آج بد حال و بے چین انسان ہے
تھک گئی روح اور دل پریشان ہے
اپنے روٹھے خدا کو منا لیجئے
اپنی اقدار سے جی لگا لیجئے

اپنا شیوہ بزرگوں کا اکرام ہے
باپ اور ماں کی خدمت پہ انعام ہے
بابِ جنت انہی کو بنا لیجئے
اپنی اقدار سے جی لگا لیجئے

عصمتوں ، عفتوں کے محافظ بنیں
گھر کی ان جنتوں کے محافظ بنیں
کفر کی آگ سے گھر بچا لیجئے
اپنی اقدار سے جی لگا لیجئے

زندگی کو بسر آؤ مل کریں
جنتوں تک سفر آؤ مل کر کریں
نفرتوں سے تعلق مٹا دیجئے
اپنی اقدار سے جی لگا لیجئے

غیر کی اس غلامی پہ نازاں نہ ہوں
بابِ توبہ کھلا ہے دعا کیجئے

ہم کو تہذیبِ اسلام پر فخر ہے
راحتوں کا یہی بیکراں بحر ہے
اپنی تہذیب کو رہ نما کیجئے
اپنی اقدار سے جی لگا لیجئے

ناصرہ عبید

قانتہ رابعہ

بازی گر

فصیحہ دو گھنٹے سے مراقبے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی عملی تصویر بنی۔ گوتم بدھ کا مجسمہ! رہ رہ کے ایک ہی سوال اچھلتا کودتا سامنے آجاتا، کیا واقعی یہ سچ ہے؟ مراقبہ کی حالت سے نکلی تو اپنی دیورانی شبانہ سے پوچھا۔

''شبو کیا واقعی لوگ ایسے ہوتے ہیں؟''

''ہاں......لوگ اس سے بھی گئے گذرے ہوتے ہیں......کئی دفعہ اشاروں کنایوں میں تمہیں سمجھایا تو تھا کہ خالی خلوص ہی کافی نہیں ہوتا ساتھ میں عقل کا استعمال بھی لازمی ہے مگر تم سمجھی ہی نہیں۔'' بالآخر ہم بھی چپ ہو گئے۔''

شبانہ نے جواب دیا۔

''مگر شبانہ اتنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ ساری بات صحیح بھی ہو تو کیا میں بندوں کی پہچان نہیں رکھتی؟''

''بی بی بندوں کی پہچان تو خدا کو ہی ہو سکتی ہے لیکن کچھ چیزیں تو بظاہر نظر آتی ہیں وہ دیکھنی چاہئیں۔'' شبانہ تیکھے لہجے میں بولی۔

''مثلاً......'' فصیحہ نے پوچھا۔

مثلاً یہ کہ چونکہ ہمارے گھر میں ننگے سر رہنا پسند نہیں کیا جاتا تو پروین صاحبہ نے ہمیں خوش کرنے کے لئے دوپٹہ لینا شروع کر دیا۔ کئی رنگ برنگے سکارف کے پیسے تم سے بٹورے۔ تم نے خوشی سے دیئے حالانکہ میں کئی دفعہ اسے بازار میں یا ادھر اُدھر ننگے سر دیکھ چکی تھی۔ پھر یہ کہ اسے معلوم تھا تم غیبت چغلی برداشت نہیں کرتیں تمہارے سامنے اگر وہ کسی کی بات کرتی تھی تو ''اللہ معاف کرے بات تو کہنا پڑ جاتی ہے'' سے شروع کرتی تھی لیکن گھر کے دیگر افراد کے سامنے اسے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی تھی......تم سے اس نے اپنے لیے نعتوں کی کئی سی ڈیز اور کیسٹیں منگوائیں اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ تمہیں نعتوں سے بہت دلچسپی ہے۔ صحیح کہہ رہی ہوں ناں میں؟'' شبانہ نے درمیان میں گفتگو چھوڑ کر پوچھا۔

''ہاں آپ صحیح کہہ رہی ہیں لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ یہ سب کچھ میرے سامنے اور مجھ سے مال بٹورنے کے لئے کرتی تھی؟'' فصیحہ نے پوچھا۔

''اس لئے کہ ہمارے سامنے اس نے کبھی نعت نہیں پڑھی جبکہ تمہیں وہ کہتی تھی کہ باجی میرا دل نعتاں وچ لگدا اے......تمہارے گھر میں وہ ذکر اذکار، حدیث قرآن کی باتوں سے تمہارا دل مٹھارتی تھی ہمارے گھروں میں اس نے بھولے سے بھی یہ موضوع نہیں چھیڑا تھا۔ اور چونکہ اسے پتہ تھا کہ تم فلموں ڈراموں سے رغبت نہیں رکھتیں اس نے تمہارا دل جیتنے کے لئے ہر اس شخص میں عیب نکالے جو ڈرامے، فلموں کا رسیا ہے جبکہ ہمارے گھروں میں قدم رکھتے ہی وہ ہر ڈرامے کی سٹوری ڈسکس کرنا فرض سمجھتی تھی۔ ہمارے گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا سکارف سر سے اتر کر کرسی پر پٹخ دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی بیزاری والے لہجے میں روزانہ کا مکالمہ:

''اف اتنی گرمی میں اندر سے بھی جلو اور باہر سے بھی۔''

''اب بس بھی کریں۔'' فصیحہ روہانسی ہو کر بولی۔

کیا وہ اتنی بے خبر بلکہ بدھو تھی کہ اپنی ملازمہ کی لچھے دار باتوں سے اس کو اپنا خیر خواہ سمجھ بیٹھی۔ اس کی ہر سستی مہنگی فرمائش کو پورا کیا اس کی ہر چھٹی پر درگذر کیا۔

''لیکن اس نے ایسے کیوں کیا شبانہ؟''

شبانہ دل کھول کر ہنسی۔ ''اس لیے کہ جس طرح کھانے کے لئے

نمکین، میٹھی، کھٹی چیزیں مل جل کر اچھی لگتی ہیں اسی طرح ہر طرح کے ہر مزاج کے لوگ بے عقل لوگوں کو عقل مند اور عقل مندوں کو بے وقوف بناتے رہیں۔ خیر دفع مارو۔ اگر وہ اتنی چالاک تھی کہ تمہارے مزاج کے مطابق باتیں اور حرکتیں کر کے چار پیسے فالتو لے گئی۔ اور مجھ سے میرے ذوق یعنی ڈائجسٹوں اور رسالوں کے نام پر کئی دفعہ پیسے لئے، نیا رسالہ بعد میں آتا پہلے وہ پچھلا لے جاتی تھی۔ بہت چیختی چلاتی تھی میں کہ مجھے پچھلی قسطوں کا خلاصہ تو پڑھنے دو مگر بھئی...... مجھ سے زیادہ لگاؤ تھا اسے ان رسالوں سے...... تم نے اگر دھوکہ کھایا تو میں نے تم سے زیادہ اعتماد کیا اس پر بس یہ سوچ کر شروع دن سے ناول رسالے پڑھنے کی جولت لگی ہوئی ہے۔ سسرال میں کوئی میرے جیسا ہم ذوق نہیں۔ چلو یہ ہے تو میٹرک پاس مگر کوئی ڈائجسٹ رسالہ پڑھے بغیر نہیں چھوڑتی۔

میں نے اس کے کہے بغیر اس کی ضرورتوں کا خیال رکھا، میں تو شاید اسے معاف کر بھی دوں مگر مسز فہیم کا حال سب سے پتلا ہے۔ وہ سسرال کے ظلم کا شکار، خود ترسی میں مبتلا تھیں ...... ان کی دکھ بھری داستانیں سن سن کر وہ ان کے آنسو پونچھتی، ہمدردی کا اظہار کرتی، طفل تسلیاں دیتی ان کی اشک شوئی کے بعد ان کے سسرال والوں کے ان ناکردہ اور نادیدہ مظالم کے بھی جھوٹے سچے قصے سناتی جن کی خالق وہ خود ہی تھی۔ مانو داستان گوئی کا مردہ فن اس کی وجہ سے زندہ ہوا......کئی کئی گھنٹے وہ اپنے اردگرد، بسنے والوں کے درد بھرے قصے سناتی۔ اور پھر ایک روز وہ ان کو ان تمام دکھوں سے نجات دلوانے، شوہر کے دماغ سے ماں کی محبت کا بھوت نکلوانے اور جن نندوں، دیورانیوں، جٹھانیوں نے اس کی زندگی اجیرن کی تھی ان پر فتح یاب ہونے کے لئے دواڑھائی سوکلومیٹر کے فاصلے پر مقیم حضرت شاہ صاحب کے ہاں لے گئی۔ ان کے مستجاب الدعوات ہونے اور ''پہنچے ہوئے'' ہونے کا روز ہی قصہ لے بیٹھتی تھی۔ مسز ہاشمی، آنٹی فرخندہ، نفیسہ اختر اور گورنمنٹ سکول کی دس بارہ ٹیچرز کے قصے اس کو ازبر تھے، جنہوں نے حضرت شاہ صاحب کے آستانہ عالیہ پر حاضری دیکر فیض پایا تھا۔ اور تمام دکھ والم سے نجات پا کر سکون زندگی گذار رہی تھیں۔ ووکیشنل انسٹیٹیوٹ کی ہیڈ خالدہ صغیر صاحبہ کی تو ازدواجی زندگی کی بربادی آخر تک پہنچتے پہنچتے شاہ صاحب کے طفیل ہی ''آبادی'' میں تبدیل ہوئی ہے۔

بالآخر وہ بھی تیار ہو گئیں۔ جب مسز فہیم اس کے ہمراہ ٹیکسی کروا کے جانے کو تیار تھیں تو اس نے من من کرتے ہوئے ''ان کی خدمت میں معمولی نذرانہ، اچھا نہیں لگتا'' انہیں چالیس ہزار روپے نذرانے کا قائل کر لیا۔

حضرت شاہ صاحب کو داستان سنانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ انہوں نے سرخ سرخ آنکھوں کو گھماتے ہوئے خود ہی اس کے دکھوں کا کچا چٹھا کھول دیا۔ طفل تسلیوں کے بعد دم کیا ہوا پانی، تعویذوں کا ایک ہار ان کے سپرد کیا۔ ''تم پر کرم ہو گیا'' کہہ کر انہیں اذنِ رخصت بھی دے دیا۔ راستے میں پروین اپنی جھگی کے قریب اتر گئی اور سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے دو چھٹیاں بھی طلب کر لیں۔

''دو چھٹیاں کس بات کی؟'' مسز فہیم نے حیرانی سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ ایک دن سفر کی تھکاوٹ اتاروں گی دوسرے دن میرے گھر والے کی بھانجی کی شادی ہے وہاں جانا ہے۔ دانت نکوستے ہوئے اس نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے دو سے تین چھٹیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ میری اپنی طبیعت سفر کی وجہ سے خراب ہو جاتی ہے۔'' مسز فہیم نے نیم رضا مندی سے کہا۔

''بس کیا مجھے اس بات کا پتہ نہیں؟'' وہ اٹھلا کر بولی۔

دو دن گذر گئے۔ تیسرے دن دوپہر بارہ ایک بجے تک انتظار کر کر کے انہوں نے اس کے دیئے موبائل نمبر پر رابطہ کیا۔ دونوں نمبر پچیس دفعہ ملانے پر بند ہی ملے۔ سارا دن اسی طرح گذر گیا، رات کو مس نے ایک شادی کی تقریب میں جانا تھا وہاں اتفاق سے ووکیشنل انسٹیٹیوٹ کی ہیڈ خالدہ صغیر، گورنمنٹ سکول کی ٹیچر عابدہ عالم بھی نظر آئیں وہ لپک کر آگے بڑھیں۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد انہوں نے روئے سخن پروین کی طرف موڑا۔

''خالدہ بھابھی، پروین آج آپ کی طرف آئی تھی؟''

''کون پروین؟'' انہوں نے الٹ اس سے سوال کیا۔

''بھئی کام والی۔ پروین جو آپ کی طرف کام کرتی تھی اور شاہ صاحب کے پاس آپ کو لے کے گئی تھی۔'' مسز فہیم نے کہا۔

''سوری بھئی وہ تو بڑی چلتر عورت تھی، ماہر نبض شناس کی طرح گھر کے مسائل کو دیکھ کر پیسہ بٹورنے والی۔ میں نے تو دو تین دن ہی رکھا لگائی بجھائی کی عادت کا اندازہ ہوا تو چھٹی کر دی اس کی میں نے۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

''اور وہ آپ کے گھریلو حالات کی درستی کے لئے شاہ صاحب کے پاس کب لے گئی تھی؟'' مسز فہیم کو ان کے جواب پر تسلی نہیں ہوئی۔

''یہ آپ نے کیا کہا؟'' خالدہ خفا ہو کر بولیں۔ میرے حالات الحمدللہ شروع دن سے قابل رشک ہیں، صغیر صاحب انگلینڈ ہوتے ہیں سال میں دو ایک چکر ضرور لگا لیتے ہیں۔ آپ کو غلط خبر دی ہے اس نے......اور آپ بھی جا کر اس کی خبر لیں بڑی تیز عورت ہے، ہر ایک سے اس کی ہم مزاج بن کر رقم اینٹھنا اس کا معمولی سا ہتھیار ہے۔'' انہوں نے تنبیہہ کی۔

اس کے بعد مسز فہیم کو چپ سی لگ گئی۔ گھر جا کر انہوں نے اسٹور روم میں بنی وارڈ روب اور لاکرز کا جائزہ لیا۔ ایک لاکر میں چابی لگی ہوئی تھی۔ ان کا چار پانچ تولے کا سیٹ غائب تھا......اُف......اس کے بعد انہوں نے اسے ڈھونڈنے کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔ نادرا کے دفتر میں جا کر اس کے شناختی کارڈ تک کی فوٹو کاپی دکھائی مگر وہ شناختی کارڈ بھی جعلی تھا......اس کی جھگیوں والی جگہ بھی خالی تھی۔ خدا جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا......مزے کی بات یہ کہ شاہ صاحب کے پاس گئیں تو وہاں پیر شاہ صاحب کا وجود بھی جعلی نکلا جو صرف ایک دو دن کے لئے وہاں پر رہائش پذیر ہوا تھا......''اللہ جانے اس کا شوہر تھا یا بھائی۔''

شبانہ داستان امیر حمزہ سنا کر چپ ہو گئی تھی۔ داستان کے ہر کردار کو پروین نے الگ انداز میں دھوکہ دیا۔ دنیا ہے ہی دھوکے کا گھر، ہر فرد یہاں دھوکہ دے رہا ہے یا دنیا سے دھوکہ کھا رہا ہے۔ رہے نام اللہ کا جس سے دنیا اور دنیا کے بازی گروں اور ان کے شر سے بچنے کی دعا کی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

خالی ہاتھ

''پھر آگئیں، لڑ کر آئی ہو؟'' امی نے بیٹی کو صحن سے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو سخت غصے میں تیوریاں چڑھائے دھپ دھپ کرتی اندر آئی تھی۔ اس نے بیگ پلنگ پر پھینکا اور صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ امی جو دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی کاٹ رہی تھیں اُسے یوں آتے دیکھ کر سبزی اور چھری وہیں رکھ کر اُس کے پیچھے اندر آئی تھیں اور اُسے حسب معمول طیش کے عالم میں دیکھ کر پوچھ رہی تھیں۔

''اب میرا اُس کے ساتھ گزارا نہیں۔'' صفورا نے انہیں غصے سے ایک جھٹکا دیا تھا۔''

''اب؟ امی نے اچنبھے سے پوچھا'' تمہارا تو پچھلے کئی سالوں سے یہی معمول بنا ہوا ہے''

''ہاں، لیکن اب......اب تو ہرگز نہیں۔''

''صفورا، ہوش کے ناخن لو، اتنے سال گزر گئے تمہاری شادی کو، لیکن سوائے لڑنے جھگڑنے کے تم دونوں نے کچھ نہ کیا، اپنے ساتھ ہم سب کو پریشان کیا ہوا ہے۔'' امی بھی غصے میں آ چکی تھیں۔

''نہ جانے کیسا جنگلی انسان ہے، میری زندگی عذاب میں کی ہوئی ہے۔'' وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی۔

''صفورا! شوہر کے لئے کیسے الفاظ استعمال کر رہی ہو۔'' امی نے ٹوکا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں وہ نہ صرف جنگلی بلکہ خودغرض، بے حس، مطلبی اور......اُس میں ہر وہ برائی ہے جو دنیا میں موجود ہے۔''

''مت بھولو کہ وہ تمہارا انتخاب تھا۔'' امی نے اُسے ماضی یاد کرایا۔''

''ہاں تھی میری چوائس، ہوگئی غلطی مجھ سے، ضروری ہے کہ ہر دفعہ مجھے یہ طعنہ پڑے۔'' اب صفورا ماں سے الجھ پڑی۔ ''بس بہت ہو گیا اب نہیں جانا مجھے دوبارہ اس گھر میں، میں نے فیصلہ کر لیا۔''

''اچھا چھوڑو، ابھی تم کچھ کھاؤ، ریلیکس کرو، اس وقت تم بہت غصے میں ہو، اور غصے میں انسان ہمیشہ غلط فیصلہ کرتا ہے۔'' امی نے اُسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''یہ غصے کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ سوچ سمجھ کر کیا گیا فیصلہ ہے۔''

''آخر ایسا کیا مسئلہ آ گیا تمہارے گھر میں؟''

''کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں، مسائل کا ایک انبار ہے اُس گھر میں......''

''تمہارے گھر میں۔'' امی نے اُس کی ''اس گھر'' کو کہنے پر تصحیح کرنا چاہی۔ نہیں اب وہ میرا گھر نہیں رہا، میں چھوڑ آئی ہوں وہ گھر......''

''بچیوں کا بھی کچھ سوچا ہے؟ تین بیٹیاں ہیں تمہاری، ان کی تعلیم، تربیت، ان کا مستقبل؟'' امی نے اُسے بیٹیوں کی زندگی کا احساس دلایا۔

''سنبھال لے گا اُن کا باپ انہیں۔ اُسی کی بیٹیاں ہیں وہ خود پال لے گا۔''

''اور تمہاری وہ کچھ نہیں لگتیں، اُن کی پرورش تمہاری ذمہ داری نہیں؟''

''بہت کر لی پرورش، نبھا لی ذمہ داری میں نے، جب اُس گھر میں رہنا ہی نہیں تو بچیوں کا احساس میں کیوں کروں۔'' اُس کے لفظوں میں نفرت کی تپش لو دے رہی تھی۔

''خدا سمجھے تم سے صفورا، تمہاری اولاد ہیں وہ، ابھی کہاں ہیں؟''

امی کو اب یکدم نواسیوں کی فکر ہوئی۔

''اسکول، اور کہاں ہونا ہے؟'' وہ لاپروائی سے بولی۔

اور اسکول سے جب آئیں گی، گھر پر تالا ہوگا تو...... کہاں جائیں گی وہ معصوم، کچھ سوچا ہے تم نے؟'' امی بھی اب جلال میں آچکی تھیں۔

''کر دیا میں نے ان کے باپ کو فون، آجائے گا وہ گھر۔'' وہ صوفے کا کشن پٹختے ہوئے بولی۔

''حد ہے صفورا، بیوی نہ بن سکیں، ماں بن کر ہی سوچ لو، اپنے گھر کو یوں تباہ نہ کرو۔'' امی کے لہجے میں اب منت در آئی تھی۔

''تباہ میں نہیں آپ کا داماد کر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ہی اب ایک دوسرے کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔''

''یہ جو تین بچوں کی زنجیر تمہارے پاؤں میں پڑی ہے، کم از کم اسی کے لئے تم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لو۔''

'نو، نیور، میں یہ زنجیر ہی پیر سے اتار پھینکوں گی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

پھر امی کتنی ہی دیر تک اُسے سمجھاتی رہیں، اُسے زمانے کے سرد گرم کے بارے میں بتاتی رہیں لیکن ایسا لگتا تھا کہ آج وہ گھر سے اٹل فیصلہ کر کے ہی آئی ہے۔ شادی کے تیرہ برس، صفورا کے بقول ایک سزا کی طرح تھے۔ جو وہ کاٹ چکی تھی اور اب وہ اس قید بامشقت سے رہائی چاہتی تھی...... ہمیشہ کیلئے!

☆......☆......☆

صفورا اور شہزاد کی پسند کی شادی تھی۔ تیرہ برس قبل دونوں نے دھواں دھار عشق کیا تھا اور نتیجہ میں گھر والوں کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی تھی۔ لیکن چند ماہ بعد ہی جب محبت کا خمار اُترا اور دونوں نے ایک دوسرے کو پرکھنا اور برتنا شروع کیا تو ایک دوسرے کی ناپسندیدہ عادات برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور نتیجہ حسب توقع تھا۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑوں نے ان کے گھر والوں کے ساتھ محلے والوں کو بھی تنگ کر مارا تھا۔ جیسی دھوا دھار محبت کی تھی اب ویسی ہی دھواں دھار نفرت پروان چڑھ رہی تھی۔ انہی لڑائی جھگڑوں کیساتھ قدرت نے انہیں تین تحفے بھی عطا کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں بچیوں کی قدر نہ تھی اور وہ تینوں اسی کھنچاؤ کے ماحول میں ڈرے سہمے پرورش پاتی رہیں۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا دونوں کے گھر والوں نے انہیں صبر، برداشت تحمل سے ایک دوسرے کے ساتھ نبھاؤ کرنے پر آمادہ کیا۔ انہیں بچیوں کے مستقبل سے ڈرایا۔ آنے والے وقت کا تاریک پہلو دکھایا لیکن نہ تو صفورا سمجھی اور نہ ہی شہزاد نے عقل کا دامن تھاما۔

انہیں حالات میں تیرہ سال گزر گئے۔ صفورا کے لئے اب اس گھر میں رہنا، شہزاد کے ساتھ گزارا کرنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ تو دوسری طرف شہزاد بھی صفورا سے بدظن ہی تھا۔ وہ کب صفورا کو اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔ کئی سال پہلے صفورا اس کے دل سے نکل چکی تھی تو پھر گھر سے نکالنے میں بھی اس نے دیر نہ لگائی اور صفورا کے طلاق کے مطالبہ پر بغیر کسی حیل حجت کے کاغذات پر دستخط کر کے اُسے روانہ کر دیئے۔

☆......☆......☆

کاغذات کی وصولیابی، صفورا کے لئے گویا رہائی کا پروانہ ثابت ہوئی تھی۔ چند دن تو اُسے اپنے فیصلے پر کچھ پچھتاوا بھی ہوا۔ امی کے اٹھتے بیٹھے احساس دلانے پر اپنے فیصلے پر پشیمانی اور افسوس کا اظہار بھی ہوا، لیکن بہت جلد وہ اس حالت سے باہر نکل آئی۔ وہ اس گھر سے نجات چاہتی تھی اور اس نے نجات حاصل کر لی تھی۔ ہاں، بچیوں کے بارے میں وہ سخت فیصلہ نہ کر سکی اور انہیں اپنے ساتھ ہی لے آئی۔ شہزاد نے بھی بیٹیوں کے معاملے میں ہٹ دھرمی نہ دکھائی اور انہیں تھوڑے پس و پیش کے بعد ماں کے حوالے کر دیا۔

☆......☆......☆

صفورا والدین کے گھر آ گئی تھی۔ یہاں اب اُس کو اپنی بچیوں کے ساتھ نئے سرے سے زندگی گزارنی تھی۔ تینوں سمجھدار تو تھیں لیکن ڈری سہمی رہتی تھیں اور ماں اور نانی نانا کے کہے کے مطابق ہی چلتیں۔ بچوں کی اسکول فیس اور دوسرے خرچوں کے لئے اُس نے کسی کا منہ دیکھنے کی بجائے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک آفس میں ملازمت شروع کر دی۔ زندگی بڑی لگی بندھی اور بے کیف ہو گئی تھی۔ اگرچہ اب وہ لڑائی

جھگڑے اور آپس کی چپقلش تو ختم ہو چکی تھی لیکن صفورا اب اپنے آپ میں گم ہوگئی تھی نہ جانے اُسے اپنے فیصلے پر پشیمانی تھی یا نہیں ۔ امی ، ابا جان نہ سکے ۔لیکن اب امی اس کی دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھیں ۔ ماں تھیں نا...... بیٹی کی زندگی اس طرح اُجاڑ اور ویران نہ دیکھ سکتی تھیں ۔

☆......☆......☆

''صفورا، رخسانہ آپا آئی تھیں آج ۔'' امی ،صفورا کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں جو آفس سے آ کر فریش ہو کر اب بچیوں کو اسکول کا کام کروا رہی تھی ۔

''اچھا، وہ تو اکثر آتی رہتی ہیں ۔'' وہ لا پروائی سے نیشا کی کاپی بیگ میں رکھتے ہوئے بولی ۔ ہاں لیکن آج وہ ایک خاص سلسلے کی وجہ سے آئی تھیں ۔'' امی نے کہا لیکن صفورا نے کوئی جواب نہ دیا ، وہ ہنوز کتابوں کی طرف متوجہ تھی ۔

''رخسانہ آپا اپنے بھائی کا رشتہ دے کر گئی ہیں ،تمہارے لئے ۔'' امی دھیرے سے بولیں ۔واٹ؟؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ ، رخسانہ آپا کا دماغ تو ٹھیک ہے ۔''صفورا نے ہاتھ میں پکڑا کاپی پٹخ کر امی کو غصہ سے دیکھا ۔

''کیوں اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ۔ وہ سیدھے سادھے طریقے سے رشتہ دے گئیں......''

''اپنے بڈھے بھائی کا جس کی جوان شادی شدہ اولادیں ہیں ، انہیں کوئی شرم ،لحاظ نہ آیا'' صفورا کا تو یہ سن کر دماغ ہی گھوم گیا تھا ، اس نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے ۔سلیم کی بیوی کو گذرے عرصہ گذر گیا ہے ۔''

''تو پھر کسی اپنے جیسی کو ہی ڈھونڈیں نا میرے لئے کیوں آ گئیں ۔''صفورا چیخ کر بولی ۔

''صفورا ،مت بھولو کہ تم بھی تین بچوں کی ماں ہو ۔''

''لیکن ابھی بوڑھی نہیں ہوئی ۔ آپ ان کو صاف صاف بتا دیجئے گا وگرنہ میں خود نمٹ لوں گی ۔'' وہ بدمزاجی سے بولی ، مزاج کی تو وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی ۔

''تم تو بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی بھول چکی ہو ۔عورت جب شادی شدہ ، اور بال بچوں والی ہو جائے تو پھر اس کی عمر نہیں دیکھی جاتی ، بس شادی اور بچے دیکھ کر ہی پھر اس کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے ۔ چاہے جوان لڑکی ہی بیوہ یا مطلقہ ہو جائے ۔''

''امی پلیز'' صفورا نے امی کی بیان کردہ حقیقت سے آنکھیں چرائیں ۔

''شہزاد کا معلوم ہے نا ،تمہیں چھوڑنے کے دو تین ماہ بعد ہی اُس نے شادی رچا لی تھی اور ابھی چند دن پہلے ہی مجھے پتہ پڑا کہ وہ تو باپ بھی بن گیا ۔'' امی نے انکشاف کیا اور صفورا جو رمنا کی کاپی میں کرایا گیا کام چیک کر رہی تھی متحیر نظروں سے امی کو دیکھنے لگی ۔

''اتنی جلدی......؟'' وہ دھیرے سے بولی لیکن امی نے سن لیا تھا ۔

''جلدی کہاں ،تمہاری علیحدگی کو سال سے اوپر ہو چلا ہے ۔ اُس نے چند ماہ بھی انتظار نہ کیا اور تم نہ جانے کیوں جوگ لئے بیٹھی ہو ۔ میں اس طرح تم کو گھر نہیں بٹھا سکتی ، میں دوبارہ تمہارا گھر بساؤں گی ۔''

''چاہے وہ بوڑھا اور جوان بچوں کا باپ ہی کیوں نہ ہو ۔''صفورا بگڑ کر بولی ۔

یہ میں نے کب کہا ، میں نے تو رخسانہ آپا کا لایا ہوا رشتہ تمہارے سامنے رکھا ہے ۔کوئی زبردستی تو نہیں کر رہی کہ اسی سے شادی کرو ۔'' امی بھی اب کچھ خفا تھیں ۔

''کیا شادی کرنی ضروری ہے ؟ آپ مجھے اپنے گھر اس طرح نہیں رکھ سکتیں ۔''صفورا تنگ آ کر بولی ۔ پچھلے چند ماہ سے امی مسلسل اس کو شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔

''نہیں'' امی نے صاف جواب دیا ''تمہارے ابا اور میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں آج ہیں کل نہیں ، تمہارے سب بھائی بہن اپنے گھروں میں آباد ہیں ۔ میں تمہیں بھی آباد دیکھنا چاہتی ہوں ۔''

''تین بیٹیاں ہیں میرے ساتھ ۔'' اس نے جیسے ماں کو جتایا ۔

''ہاں وہ ہم رکھ لیں گے، تمہارے ابا نے کہہ دیا کہ صفورا اسے کہنا ان کی شادیاں میں کروں گا۔ وہ بچیوں کی فکر نہ کرے۔'' امی نے نرمی سے کہا اور صفورا سر جھکا کر رہ گئی۔

''والدین بھی نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں اولاد کی غلطیاں، ہٹ دھرمیاں، من مانیاں، کھلے دل سے معاف کئے چلے جاتے ہیں اور ان کے لئے زندگی کے راستے صاف کیے جاتے ہیں۔'' صفورا سوچ کر رہ گئی تھی۔ اسی طرح چند ماہ اور کھسک گئے۔

☆......☆......☆

''صفورا! کس کے ساتھ آئی ہو؟'' امی نے اندر آتی بیٹی سے پوچھا جو ابھی آفس سے آئی تھی۔ امی نے کھڑکی سے اُسے کسی کی گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

''وہ......اظہر کے ساتھ۔'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''تمہارے آفس میں کام کرتا ہے۔'' امی نے بغور اُسے دیکھا۔

''جی'' صفورا سر ہلاتے ہوئے بولی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اور پھر یہ سلسلہ رکا نہ تھا۔ صفورا اب اکثر اظہر کے ساتھ آفس سے گھر آنے لگی تھی۔ وہ فارغ وقت اس سے فون پر بھی باتیں کرتی۔ اُس کے چہرہ پر اب مسکراہٹ رہتی۔ اُس نے دوبارہ سے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے کپڑے، جوتے، جیولری وہ اب نئے سرے سے ہر چیز پر دھیان دینے لگی تھی۔ چند ہفتے تو امی خاموشی سے یہ سب دیکھتی رہیں پھر آخر ایک دن انہوں نے بیٹی کو بٹھا کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''تم آج بھی اظہر کے ساتھ آئی تھیں؟'' امی نے صفورا سے رات کھانے کے بعد جب وہ بچیوں کے یونیفارم استری کر رہی تھی پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی؟'' وہ چونکی ''جی'' اب اُس نے اثبات میں جواب دیا۔

''یہ اظہر شادی شدہ ہے؟'' اب کے دوسرا سوال آیا تھا۔ اس دفعہ صفورا نے صرف ہاں میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کیا چاہتا ہے وہ؟'' یہ تیسرا سوال صفورا کو گڑ بڑانے کے لئے کافی تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی ''کیا وہ سنجیدہ ہے؟'' چوتھا سوال بھی ڈائریکٹ تھا۔

''صفورا جواب دو، کیا وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''جی'' صفورا کی آواز آہستہ تھی۔

''کیا بیوی مر چکی ہے؟''

''نہیں'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو کیا بچے نہیں ہیں؟'' امی کچھ پریشان ہوئیں۔

''ہیں''

''بیوی، بچے موجود ہیں تو پھر وہ کیا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''

امی حیران تھیں

''وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں لہٰذا......'' صفورا اٹکی۔

''اوہ'' اب امی سمجھیں ''تو اس نے جال بچھایا ہے''

''نہیں، نہیں وہ مجھ سے سنجیدہ ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''تم نے اس سے اپنے بچوں کی بات کی کیا وہ انہیں رکھ لے گا؟''

''نہیں میں نے اس سلسلے میں ابھی اُس سے کوئی بات نہیں کی، لیکن وہ مجھے علیحدہ گھر ہی لے کر دے گا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''صفورا جو بھی فیصلہ کرنا خوب سوچ سمجھ کر کرنا، تاکہ آئندہ تم کو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔''

صفورا نے ایک دفعہ پھر سر ہلا دیا تھا اور امی کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی تھیں۔

اور پھر اگلے ہی ہفتے اظہر اپنے ایک دوست کے ساتھ صفورا کے والدین سے ملنے اور رشتہ لینے آ گیا تھا۔ صفورا کے والدین کو اگر اظہر میں کوئی خاص بات نظر آئی تھی تو بظاہر کوئی برائی بھی نہ دکھائی دی۔ بقول اس کے وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں تھا اور اب دوسری شادی کر کے ایک مطمئن زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ پہلی بیوی تو وہ چھوڑ بھی نہ سکتا تھا کہ اُس سے اس کے دو بچے تھے۔ صفورا کو وہ الگ فلیٹ میں رکھے گا، اس کا خرچہ اٹھائے گا اور باری باری دونوں بیویوں کو وقت دے گا۔ مختصر یہ کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرے گا اور حتی الامکان انصاف کرے گا۔ ابا کے

بچیوں کی بابت پوچھنے پر اس نے معذرت کر لی تھی کہ وہ صفورا کی بچیوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھے گا ہاں کبھی کبھی صفورا لڑکیوں کو اپنے ساتھ فلیٹ میں لاسکتی ہے اور خود ان سے جب دل چاہے یہاں آکر مل سکتی ہے اُسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

''ابا نے اظہر کی ساری باتیں صفورا کے سامنے رکھ دی تھیں۔اور صفورا نے مستقبل کی اچھی آس میں اور کچھ یہ سوچ کر کہ وہ بعد میں اظہر کو بچیوں کے سلسلے میں منالے گی ، بغیر اعتراض کیے گردن ہلا دی تھی۔ ویسے بھی بہت سے امور تو صفورا اور اظہر نے آپس میں پہلے ہی طے کر لئے تھے۔والدین کے سامنے تو صرف رسمی کارروائی ہی ہو رہی تھی۔ابا کی طرف سے حامی بھرنے کی دیر تھی۔اظہر نے اپنے کسی دوست کے ذریعے ایک دو کمروں کا فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔وہاں ضرورت کی چند چیزیں بھی لے آیا تھا۔کچن بھی سیٹ کر دیا تھا۔ایک مہینہ بعد ہی ابا نے صفورا کا سادگی سے نکاح کر کے اُسے اظہر کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ والدین تو اس کے حیات نہ تھے لہٰذا بارات میں اظہر اپنے چند دوستوں ان کی بیگمات اور اپنی ایک بہن کو لے کر آیا تھا۔جبکہ ابا نے اپنے چند چیدہ چیدہ رشتہ داروں کو بلا لیا تھا تاکہ بزرگوں کی دعاؤں کے سائے تلے نئی زندگی کی ابتدا ہو۔

☆......☆......☆

صفورا کے سامنے اظہر کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی۔اسے بہت اچھی طرح اسکے بیوی بچوں کا علم تھا لیکن اس کے باوجود، وہ اس کی بٹی ہوئی زندگی سے سمجھوتہ نہ کر پا رہی تھی۔اگرچہ اظہر نے اس سے صاف صاف یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔اور دونوں گھروں میں ہفتے کے تین تین دن رہے گا لیکن صفورا بضد تھی کہ وہ اسے زیادہ ٹائم دے اور اسی طرح دونوں کے درمیان آہستہ آہستہ یہی معمولی باتیں سنگین نوعیت اختیار کرنے لگیں اور ایک دفعہ پھر صفورا کی زندگی جھگڑوں کی نذر ہونے لگی۔دوسری طرف اظہر بھی دو طرف بٹ کر ذہنی طور پر بہت دباؤ میں تھا اور دوسری شادی کر کے کچھ کچھ پچھتا بھی رہا تھا۔صفورا اس کے لئے کوئی آئیڈیل بیوی ثابت نہ ہو رہی تھی۔شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔تینوں بیٹیاں اس کی ،اس کے والدین کے ہی زیر کفالت تھیں۔وہ چاہتے ہوئے بھی ان کو اپنے گھر نہ لاسکی تھی۔نہ ہی اظہر سے اس کا کوئی بچہ ہوا تھا نہ جانے اس میں اظہر کی مرضی نہ تھی یا قدرت کی ہی مصلحت یہی تھی۔آخر روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آکر ایک دفعہ پھر صفورا اپنے دامن پر طلاق کا داغ لگائے والدین کے گھر آگئی تھی۔

☆......☆......☆

دوسری ازدواجی زندگی بھی صفورا کو راس نہ آئی تھی۔وہ بہت گم صم ہوگئی تھی۔تینوں بیٹیاں اب بڑی ہو رہی تھیں۔انہوں نے ماں کو بہت سہارا دیا تھا۔وہ اپنی بچیوں کو دیکھتی اور پھر اپنی ناکام زندگی کو دیکھتی تو لرز جاتی کہ کہیں اس کی بیٹیاں بھی ایسی اذیت بھری زندگی نہ گزاریں۔وہ اپنی منحوس زندگی کا سایہ بھی ان پر ڈالنا نہ چاہتی تھی۔اس نے زندگی میں ہر دفعہ شادی کے نام پر ٹھوکر ہی کھائی تھی۔اب نہ جانے اس میں کس کا قصور تھا! امی ،ابا تینوں بچیوں کی تربیت بہت اچھی طرح کر رہے تھے۔ انہوں نے تینوں بچیوں کے دل سے ڈر خوف نکال کر خود اعتمادی بخش دی تھی ،انہیں مضبوط کردار بنایا تھا۔لیکن وہ تینوں اپنی اس خود اعتمادی کا، صفورا کی طرح ناجائز فائدہ نہیں اٹھا رہی تھیں وہ نانا ، نانی کی فرمانبردار تھیں اور ان کی خواہشوں کا عکس بن رہی تھیں۔

☆......☆......☆

آج بہت عرصے بعد صفورا کی پھوپھی کی بیٹی اُس سے ملنے آئی تھی۔دونوں گیا زمانہ یاد کر رہی تھیں۔نادیہ نہ صرف اس کی کزن بلکہ پرانی محلّہ دار بھی تھی جب وہ شہزاد کے گھر میں رہتی۔

''تم اب بھی اُسی گھر میں رہائش پذیر ہو۔''صفورا نے پوچھا۔

''اب تو نہیں ، تین ماہ پہلے ہی وہاں سے شفٹ ہوئے ہیں۔ ویسے صفورا تم اظہر سے طلاق کے بعد دوبارہ شہزاد سے شادی کر سکتی تھیں۔تمہاری بے رنگ زندگی دیکھ کر تو مجھے بھی رونا آتا ہے۔''

''شہزاد سے......نادیہ تم ہوش میں ہو، میں کیوں دوبارہ اُس سے شادی کرتی جبکہ اُس نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔میرا جینا مشکل

کیا ہوا تھا۔'' صفورا ناراضگی سے بولی۔ اُسے نادیہ کی بات پسند نہ آئی تھی۔ رسی جل گئی تھی لیکن بل نہ گیا تھا۔

''کیا پتہ اب وہ ویسا نہ رہا ہو۔ وقت تو بڑے بڑے سورما کو ٹھیک کر دیتا ہے یہ شہزاد کیا چیز ہے۔ اُس کی دوسری بیوی تو دو بچے چھوڑ کر شادی کی صرف تین سال بعد ہی مرگئی تھی۔''

''ہاں مجھے پتہ چل گیا تھا۔''

اس کی بیوی مرگئی تھی، ادھر تم پھر تنہا تھیں تو تم لوگوں کو چاہئے تھا پھر سے ایک ہو جاتے تمہاری بچیوں کو باپ کا سایہ مل جاتا، اور تم کو بھی شوہر کا سہارا، ہمارے معاشرے میں عورت بغیر مرد کے کچھ نہیں۔'' نادیہ کہہ رہی تھی اور صفورا پہلو بدل رہی تھی لیکن خاموش تھی۔ اس حقیقت کو اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اگر آج ابا نہ ہوتے تو نہ جانے اس کی بچیوں اور خود اس کا کیا ہوتا۔

''بے چارے دونوں بچوں کی تو قسمت پھوٹی ہی، شہزاد بھی نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا، ایک بچہ پھوپھی لے گئی تو دوسرا خالہ نے رکھا، پھر کہہ سن کر رشتہ داروں نے اس کا تیسرا نکاح کروایا۔ ویسے اب جس خاتون سے شہزاد نے نکاح کیا ہوا ہے بڑی بھلی عورت ہے۔ اُس نے شہزاد کے گھر کو گھر بنا دیا۔ اُس کے دونوں بچوں کو بھی واپس گھر لے آئی اور خود ہی پال رہی ہے۔ بڑی ہی نیک عورت ہے۔ کہتی ہے جب بچوں کا باپ سر پر ہے تو بچے بھی اسی کی شفقت کے سائے تلے پرورش پائیں۔ محلے والے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسے، میں بھی وہاں سے جانے سے پہلے اس سے مل کر آئی تھی۔ بڑی محبت سے ملی۔'' نادیہ تو رطب اللسان تھی۔

''اپنی جو اولاد نہیں ہے اسی لئے سوکن کے بچوں سے ممتا ٹھنڈی کر رہی ہوگی۔'' صفورا سر جھٹک کر بولی۔

''اے لو یہ کیسی بات کہی، اس نیک عورت کو خدا نے اولاد سے محروم نہ رکھا، اس کی اپنی بچی بھی ہے۔ اب تو وہ بچی بھی چار پانچ سال کی ہوگی۔'' نادیہ کہہ رہی تھی لیکن پھر صفورا کے ردِعمل کو دیکھ کر موضوع بدل دیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ اپنی بیٹی کی شادی کب کر رہی ہو؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے اس کی بات طے کر دی۔''

''ہاں، ابا نے اپنے کسی ملنے والوں کے ہاں رشتہ کر دیا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ لڑکا مسقط میں جاب کرتا ہے۔'' صفورا کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''اتنی دور بھیج دو گی۔''

''اللہ اس کے نصیب اچھے کرے، جہاں رہے خوش رہے۔''

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک کہتی ہو۔'' نادیہ تیزی سے سر ہلانے لگی۔

☆......☆......☆

ابا، امی نے نواسیوں کی ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی۔ بڑی بیٹی کی شادی کے بعد منجھلی رمنا بھی اپنے گھر کو سدھاری۔ رمنا کی شادی کر کے ابا بہت بیمار پڑ گئے تھے۔ کمزور تو تھے ایک دن ایسے سوئے کہ اٹھ نہ سکے۔ اُن کی موت نے امی کو بھی بیمار کر دیا تھا۔ وہ ایک دم ہی برسوں کی بیمار اور بوڑھی لگنے لگیں۔ اب صفورا کو ہی ہمت کرنی تھی۔ جب تک باپ سر پر تھے وہ نیشا کی طرف سے بے فکر تھی۔ لیکن باپ کے جاتے ہی اُسے نیشا کی فکر ستانے لگی تھی۔ پھر ایک اچھا سا رشتہ دیکھ کر اُس نے نیشا کے ہاتھ بھی پیلے کر دیئے۔

آج نیشا کی رخصتی تھی، نیشا بہنوں کے ساتھ پارلر گئی ہوئی تھی اور وہ گھر کے بکھیڑے سمیٹ رہی تھی۔ امی کا کمزور وجود آج بھی اس کا مضبوط سہارا تھا۔ تیار ہو کر وہ ماں بیٹی، بھائی کی فیملی کے ساتھ شادی ہال پہنچی تھیں۔ اُس نے ماں کو اسٹیج کے پاس صوفے پر بٹھایا اور خود مہمانوں کے استقبال کے لئے کھڑی ہوگئی۔ مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر میں نیشا بھی دونوں بہنوں کے ساتھ آگئی تھی۔ تینوں کے چہرے خوشی و مسرت سے جگمگا رہے تھے اُس نے آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے لگایا اور پیچھے ہٹ گئی، دونوں بہنیں اُسے اسٹیج کی طرف لے جا رہی تھیں۔ اُس کی دعائیں تھیں یا اس کے والدین کی کہ آج اس کی دونوں شادی شدہ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں بہت خوش باش زندگی گزار رہی تھیں۔ ماں باپ کی زندگی کے تجربہ کے برعکس دونوں اپنے گھروں میں مطمئن تھیں۔ نانا، نانی نے نہ جانے انہیں اگلے گھر رہنے کا کیا درس دیا تھا کہ وہ

شوہر کے ابرو کے اشارے پر چلتی تھیں اور شوہر اپنی بیویوں کو نہ صرف گھر کی بلکہ دل کی بھی ملکہ بنائے بیٹھے تھے۔ صفورا کم از کم اس سلسلے میں تو زمانے کے آگے سرخرو تھی۔

نیشا کی رخصتی کا لمحہ آ گیا تھا۔ ماں اور بہنوں کے گلے لگ کر اب وہ باپ کی دعائیں لے رہی تھی۔ شہزاد اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ صفورا نے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دونوں بیٹیوں کی شادی کی طرح اس دفعہ بھی اُسے بلایا تھا۔ اور شہزاد اپنی بیوی اور تینوں بچوں کے ساتھ شادی کی ہر تقریب میں پیش پیش رہا تھا۔ بڑی بیٹی کی شادی کے وقت جب ابا نے اس سے کہا تھا کہ وہ شہزاد کو اس موقع پر بلائیں گے تو اس نے ابا سے بڑی بحث کی تھی۔ لیکن ابا نے اس کی ایک نہ مانی تھی۔ پھر سب نے دیکھا کہ شہزاد نہ صرف بیٹی کی شادی میں شریک ہوا بلکہ اس نے کئی کاموں کی ذمہ داری بھی ابا سے لے لی تھی اور بیٹی کو بڑے قیمتی تحائف دیئے تھے۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا تھا تو اب صفورا کیوں باپ کی قائم کردہ روش سے پیچھے ہٹتی۔ اس نے دونوں بیٹیوں کے ذریعے شہزاد کو کارڈ بھجوا دیا تھا اور شہزاد نے حسب معمول شادی کے معاملات میں حصہ لیا تھا۔ نیشا کی رخصتی کے بعد سارے قریبی رشتہ دار بھی آہستہ آہستہ جانے لگے تھے۔ تبھی شہزاد کی بیوی اُس کے پاس آئی تھی۔

''اب اجازت، انشاءاللہ پرسوں ولیمہ میں آئیں گے۔'' وہ بولی تھی اور صفورا نے آنسو پیتے ہوئے سر ہلاتے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ پلٹی اور تینوں بچوں اور شہزاد کے ساتھ باتیں کرتی بڑی مطمئن اور آسودگی سے ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

صفورا خالی ہاتھ، خالی دامن ان کو دیکھ رہی تھی۔ آج اُسے اپنا آپ بڑا بے مایہ لگ رہا تھا۔ وہ خود کو ایک ٹھکرائی ہوئی عورت محسوس کر رہی تھی۔ ایک ٹھوکر کھا کر بھی نہ سنبھلی اور زمانے نے اسے دوسری ٹھوکر بھی دے دی۔ شہزاد مرد تھا، وقت گزرا تو سنبھل گیا اور ایک گھر بنا لیا۔ لیکن وہ کیسی عورت تھی جو حالات کی مار سے بھی نہ سنبھل سکی اور اب زندگی کے سفر کو اس نے تنہا ہی کاٹنا تھا......اپنے پچھتاووں کے ساتھ!

☆......☆......☆

مضروبہ

اسے یہ بات خود بھی نہیں معلوم تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے۔ بس ایک پڑھائی کے علاوہ اس کو کسی بھی قسم کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اس پر بھی شکر گزار تھی کہ چلو پڑھائی میں اس کا دل بھی لگتا ہے اور وہ اس میں ایک عجیب سی راحت بھی محسوس کرتی ہے اگر اس کا دل پڑھائی سے بھی اچاٹ ہو جاتا تو پھر وہ اپنا وقت کس طرح گزارا کرتی

مہوش والدین کی اکلوتی اولا تھی، والد ہوں یا والدہ، دونوں ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے اور بچپن سے اب تک اس پر بھر پور توجہ دیتے آئے تھے۔

اس کے والد اپنے والدین کی اکلوتی اولا د تھے لیکن اس نے اپنے دادا دادی کو اپنے ہوش میں نہیں دیکھا تھا البتہ اس کے ماں باپ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش پر اس کے دادا، دادی نے بہت زیادہ خوشی منائی تھی لیکن ان دونوں کا انتقال اس کی دوسری سال گرہ سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اتنا اچانک ہوا کہ سارے ہی لوگ حیران وافسردہ ہو گئے لیکن اللہ کی مرضی میں کسی کا کیا دخل۔

اس کے والد سرکاری ملازم تھے اور درمیانے درجے کے آفیسر تھے، گھر بھی مناسب ہی تھا نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا، اس کے خیال میں اہل محلّہ بھی اچھے ہی تھے، انھیں کی طرح سادے اور درمیانی درجے کے لیکن جو خوبی اس کو دیگر بہت سارے محلوں اور بستیوں سے منفرد نظر آتی وہ یہ تھی کہ اس محلے کے سارے چھوٹے بڑے بہت ہی نیک اور شریف تھے۔ سارا بچپن انھیں کے درمیان گزار کر جوان ہوئے بھی اسے کئی برس گزر چکے تھے لیکن اسے ایسا ہی لگا کہ وہ اپنے سگوں کے درمیان پل کر جوان ہوئی ہو شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے سارے کے سارے مکین قریب قریب ایک ساتھ ہی آکر آباد ہوئے اور شاید ہی کسی نے اپنا مکان کسی اور کے ہاتھ فروخت کیا ہو البتہ کچھ مالکان نے اپنے مکانوں کے پورشن ضرور کرایوں پر اٹھائے ہوئے تھے لیکن اس بات کی تصدیق کے بعد کہ آنے والے نیک اور شریف ہوں۔

مناسب گھر، مناسب ساز وسامان، نہ بہت بے نیازی اور نہ بہت سجاوٹ والی بناوٹی اشیاء، وہ خود یا اس کے والدین نہ تو بہت ایڈوانس اور نہ ہی تنگ نظر، اگر بہت مثالی گھرانہ نہیں تو کوئی ناپسندیدگی سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی دیکھتا تھا۔

والدین کی اس پر بھرپور توجہ بھی تھی اور وہ اس سے بہت پیار بھی کرتے تھے لیکن وہ پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ انھوں نے اس سے بیجا لاڈ پیار کبھی نہیں کیا اور شاید ہی کوئی ایسی فرمائش پوری کی ہو جو بیجا ہو یا پھر ان کی قوت خرید یا صلاحیتوں سے سوا ہو، ایسی کسی فرمائش یا ضد پر اسے کبھی ڈانٹا بھی نہیں گیا البتہ بہت پیار اور سلیقے سے اس کو ہر بات سمجھائی گئی خواہ اپنی بات سمجھانے میں انھیں کتنا ہی وقت صرف کرنا پڑا ہو۔

یہ بات اس کی عادت میں شامل تھی کہ وہ کالج جانے سے پہلے پہلے گھر کے بیشتر کام کاج نپٹا کر جایا کرتی تھی، والدہ ضعیف ہو چلی تھیں، والدہ اور والد صاحب نے کوئی ماسی اس لئے نہیں رکھی تھی کہ والد صاحب اور اس کے چلے جانے کے بعد کوئی اور گھر پر نہیں ہوتا تھا اور وہ کسی پر اتنا بھروسہ نہیں کرتے تھے کہ سب کی غیر موجودگی میں کسی اجنبی خاتون کو گھر کے کونے کونے میں گھسنے کی اجازت دیں، اس لئے اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس کے کالج جانے کے بعد کام کا بوجھ اس کی والدہ پر کم سے کم پڑے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی والدہ گھر کے سارے کام ہمیشہ کی طرح اب بھی بہت تن دہی سے انجام دیا کرتی تھیں لیکن اب وہ محسوس کرتی تھی کہ زیادہ کام کاج کی وجہ سے وہ کافی تھک جاتی ہیں۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ اس کا اظہار شاید ہی کرتی ہوں۔ اس کی یہ ساری صفات اس کی گھر گھر شہرت کا سبب تھیں اور بلا شبہ وہ تھی بھی اس لائق کہ

اس کی تعریف کی جائے۔

آج وہ ساری باتیں سوچ سوچ کے حیران بھی ہو رہی تھی اور دل ہی دل میں بہت پریشانی محسوس کر رہی تھی کہ آخر اس کو کیا ہو گیا ہے، ہر کام سے اس کا دل آخر اتنا اچاٹ کیوں ہو گیا ہے، گھر کے وہ سارے کام جو وہ بہت ذوق و شوق سے کیا کرتی تھی، اب کئی ہفتوں سے اسے ان کاموں میں کوئی دلچسپی ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ گھر جو ہر وقت چماچم کیا کرتا رہتا تھا اب پھوہڑ پنے کی تصویر بنا نظر آتا ہے اور خاص کر اسکی خوابگاہ تو بس لگتی ہی نہیں تھی کہ کسی کالج گوئنگ لڑکی کی خوابگاہ ہوگی، لگتا تھا جیسے وہ کالج کے ہاسٹل کا کوئی کمرہ ہو اور وہ بھی کسی انتہائی زندگی سے بیزار لڑکے کا۔

اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی والدہ نے اسے کئی مرتبہ اس بات پر ٹوکا کہ اسے کیا ہو گیا ہے، گو کہ ان کی اس ٹوکا ٹاکی میں کسی بھی قسم کی کوئی سختی یا تلخی نہیں ہوتی تھی پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اپنی اصلاح کی جانب جانے کی بجائے اور بھی بگاڑ کی جانب بڑھ گئی اور اب وہ اپنی خوابگاہ کو تو موہنجوداڑو کا نمونہ بناتی ہی تھی، رات کے کسی پہر پڑھائی کے بہانے ڈرائنگ روم میں کیا گھستی کہ اس کو بھی کباڑ خانے میں تبدیل کر دیا کرتی تھی۔ اس کو اس وقت شرمندگی محسوس کرنے کی بجائے نہ جانے کیوں اور بھی غصہ آتا جب وہ واپسی پر یہ دیکھتی کہ اس کا کمرہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ سجا ہوا ہے اور ڈرائنگ روم کی ہر چیز ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی ہے، ابھی اس کی ناگواری اظہار میں بدلی بھی نہیں ہوتی تھی کہ پیچھے سے ماں کی آواز کان سے ٹکراتی ''بیٹی اپنا یونیفارم تبدیل کر کے کھانے کی میز پر آجاؤ''۔

آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟ وہ تقریباً چیخ پڑی، شکر ہے اس کی آواز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ کمرے سے باہر بھی چلی جاتی۔ وہ سوچنے لگی کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟ کھانا پکانا اس کو برا لگنے لگا ہے، گھر کے معمولی کام کھانے کو دوڑنے لگے ہیں، اول تو وہ ان سب امور میں اپنے آپ کو شریک ہی نہیں کرنا چاہتی اور اگر یہ سب کام کرنے ہی پڑ جاتے تو اتنی بے دلی کے ساتھ کرتی کہ بس اللہ ہی معاف کرے، اس کے پکائے ہوئے کھانے پر اب اعتراضات بھی سامنے آنے لگے تھے لیکن ان شکووں میں بھی اسے لہجہ پیار والا ہی ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس میں مثبت تبدیلی کیوں نہیں آرہی؟ اس کو اپنی والدہ کے بڑھاپے کا خیال کیوں نہیں آرہا؟

حد تو یہ ہونے لگی کہ اب کئی دنوں سے جب وہ کالج سے آکر اپنی خوابگاہ کھولتی تو وہ اسی طرح کباڑ خانہ بنی ہوئی ہوتی ہے جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی، البتہ ڈرائینگ روم سمیت سارا گھر چم چما رہا ہوتا تھا، پہلے دن تو اسے اس بات پر بہت ہی غصہ آیا کہ اس کی والدہ نے اس کے ساتھ یہ کیا کرنا شروع کر دیا پھر اس نے سوچا اچھا ہی ہے، مجھے روز روز تو اپنا کمرہ کباڑ خانے میں تبدیل نہیں کرنا پڑتا۔ نہ جانے پھر بھی اس کی طبیعت اصلاح احوال کی جانب مائل کیوں نہ ہوئی۔ آج وہ اسی ''کیوں'' کی کرید میں لگی ہوئی تھی اور نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

اسے آج کالج کا وہ پہلا دن بھی یاد آنے لگا جب وہ ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح کالج کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ دو قدم بھی نہیں چلی ہوگی کہ اس کے کانوں میں ''خوش آمدید'' کی مترنم آواز گونجی، اسی کی عمر کی معقول صورت ایک لڑکی نے اس کا استقبال کیا اور بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ فوری طور پر تو کچھ نہ سمجھ سکی کہ کیا ماجرا ہے کیونکہ اس نے اپنے اسکول کے زمانے میں سن رکھا تھا کہ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو پہلی پہلی بار کالج کا رخ کرتے ہیں ان کو بہت سے سٹوڈنٹ بیوقوف بناتے ہیں، کہیں یہ وہی نہ ہو، اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیسی لڑکی تھی وہ جس نے اس کے دل و دماغ کو جیسے پڑھ لیا ہو، ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی، پگلی! ایسی ہی لڑکیوں سے بچانے کے لئے تو ہم یہاں کیمپ لگاتے ہیں، چلو دکھاؤ اپنے ڈاکومنٹس، چلو میں تم کو تمہارے شعبے اور کلاس میں چھوڑ کر آتی ہوں۔

وہ اسے کلاس میں بھی تنہا نہیں چھوڑ گئی، ایک اور لڑکی کے سپرد کیا اور اس طرح اس کی کالج لائف کا آغاز ہوا، اس نے حیرت سے سوچا آخر وہ خود کہاں غائب ہو گئی؟ اگلے روز ہی یہ مسئلہ بھی حل ہوا، وہ پھر کالج کے گیٹ کے قریب ہی ملی، سلام دعا اور حال احوال کے بعد تعارف ہوا تو اس نے بتایا کہ اس کا نام عائزہ ہے اور کہا کہ اس کا شعبہ دوسرا ہے لیکن امید ہے کہ اس کی دوستی اسی طرح برقرار رہے گی۔

اسے کالج میں دو سال ہونے کو آئے تھے، قریب قریب ہر روز عائزہ سے اس کی ملاقات ہوتی تھی، وہ ہر لحاظ سے اس کو اتنی اچھی لگنے لگی تھی کہ اکثر وہ سوچتی کہ کاش میرا کوئی بھائی بھی ہوتا تو میں اس کو اپنی بھابی بنالیتی...... یا پھر اس کا بھائی...... استغفر اللہ بالکل فضول سوچ ہے...... کہہ کر وہ اپنے ذہن کو جھٹک دیتی۔

ایک دوسرے سے دو سالہ واقفیت نے ان دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کا احوال بھی لیتی رہتیں اور اپنے گھروں کے حالات بھی شیئر کرتی رہتیں، اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کی رہائشی کالونی اس کے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں۔

چند ہفتے پہلے کی بات ہے جب وہ چھٹی کے بعد کالج سے باہر نکلی تو گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک نوجوان اپنے موٹر سائیکل پر کھڑا نظر آیا، یوں تو وہاں بیسیوں لڑکے، خواتین، مرد چھٹی کے وقت ہوا ہی کرتے تھے جو کسی نہ کسی کو لینے آئے ہوئے ہوتے تھے، اس دو سال کے عرصہ میں اس نے ایک بار بھی یہ بات محسوس نہیں کی کہ یہاں کھڑے ہونے والے کسی اور مقصد کے لئے بھی آتے ہوں گے، اس لئے اس نے آتے جاتے کسی قسم کی کوئی جھجک محسوس نہیں کی...... لیکن...... نہ جانے کیوں اس سے نگاہیں ملتے ہی اس کی دھڑکن کیوں تیز ہوگئی، اس نے اس بات پر بہت غور کیا، اس لڑکے کی آنکھوں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی، کوئی شرارت بھی نہیں تھی، کوئی غلط نگاہی کا تاثر بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس کی یاد داشت میں یہ بات محفوظ تھی کہ اس نے اس کا بغور جائزہ لیا ہو، غور کرنے پر اسے یہ سب کچھ اپنے ہی دل کا کوئی چور لگا۔

اب کافی پابندی سے وہ کالج کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر نظر آتا۔ کبھی اسے یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہے لیکن پتا نہیں اس کی اپنی حالت کیوں عجیب سی ہو جاتی۔ اس نے بہت غور کیا تو اس کو ایسا لگا کہ اس کے اندر کا لڑکی پن شاید کروٹیں لینے لگا ہے۔

کلاک نے رات کا ایک بجایا تو وہ چونکی۔ نیند تو غائب ہو ہی چکی تھی، اس کو پیاس نے ستایا تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی، پانی پی کر وہ مڑی ہی تھی کہ اس نے محسوس کیا کہ ابو امی کا کمرہ روشن ہے، وہ تو کبھی دیر تک نہیں جاگتے، وہ فکر مند ہوگئی، اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، یہ حرکت اس نے بہت ہی غیر ارادی طور پر کی تھی، دیکھا کہ اس کے والد اور والدہ بڑی فکر مندی اور رازداری سے کسی بات پر غور کر رہے ہیں، دھیان آتے ہی وہ اپنی اس غیر اخلاقی حرکت پر شرمندہ ہوئی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی

باقی ساری باتیں تو وہ بھول گئی، یہی فکر اس پر سوار ہوگئی کہ آخر اتنی رات گئے اس کے والدین کس فکر اور تردد کا شکار تھے اور یہی سوچتے سوچتے نہ جانے وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلے دن جب وہ تیار ہو کر کالج جانے لگی تو اس کی والدہ کی آواز آئی، بیٹی آج ناشتہ نہیں کرو گی، نہیں امی! دل بھی نہیں چاہ رہا اور کالج سے دیر بھی ہوگئی ہے، وہیں کینٹین میں کچھ کھا پی لونگی، یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی والدہ کی آنکھوں اور لبوں پر جیسے مسکراہٹ سی تھی۔ وہ اس وقت تو عجلت کے ساتھ کالج کے لئے نکل گئی لیکن سارے راستے اسے اپنی والدہ کی وہ زیر لب مسکراہٹ یاد آتی رہی۔

کالج آئی تو خلاف معمول اس کو اپنی پرانی سہیلی بھی نہیں دکھائی دی جو روز ملا کرتی تھی، کینٹین میں بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی، یہ کیا ماجرا ہو گیا؟ کیا آج ہر چیز میرے خلاف ہی جائے گی؟ آج تو اس نے اپنے کمرے کی حالت ابتر کرنے کے سارے ریکارڈ ہی توڑ ڈالے تھے، حد یہ ہے کہ اپنے شب خوابی کے کپڑے بھی یونہی فرش پر چھوڑ دیئے تھے۔ آج اسے بھی نہیں آنا تھا...... کیا کروں!! پہلی مرتبہ اس کا دل پڑھائی سے بھی اچاٹ ہوتا محسوس ہوا۔ جی میں آئی کہ وہ کپڑے پھاڑ کے کسی جنگل کا راستہ لے۔ لیکن یہ سب تو کتابی باتیں ہیں، اس نے ٹھنڈا پانی منگوا کر پیا تو کچھ سکون آیا۔ وہ سوچتی رہی کیا محض عائزہ کے نہ آنے سے میری یہ حالت ہو رہی ہے؟ دل نہ چاہنے کے باوجود اس نے باقی ماندہ پیریڈ اٹینڈ کئے اور واپسی کا ارادہ کیا۔ قدم تھے کہ جیسے من من بھر کے ہو کر رہ گئے تھے، نہ جانے چند قدم دور کالج کا گیٹ بھی میلوں دور کیوں لگا۔ گیٹ سے باہر آ کر نگاہیں بے ارادہ کسی کو تلاش کرنے لگیں لیکن آج ہر بات وہ ہونی تھی جس میں اسکی مخالفت پائی جاتی ہو، آج وہ

بھی نہیں تھا، آخر وہ اس کا کون تھا، یہ بات وہ اپنے دل کو کبھی نہ سمجھا سکی۔لیکن آج یہ انہونی بات ضرور ہوئی کہ اس کی غیر موجودگی نے اس پر بہت سے راز کھول دیے۔اس کے اندر کی سچائی آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔اس کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی یہ بدلی ہوئی حالت اسی ایک شخص کی وجہ سے ہے، جس کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں، مگر جس کا وہ ہر روز غیر محسوس طور پر انتظار کرتی ہے۔جس کو دیکھ کر ہی اس کے دل کی وہ حالت ہوئی تھی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی اور جس نے اس کو ایک سگھڑ لڑکی سے نہایت بے سلیقہ اور اکھڑ انسان بنا دیا تھا، اب اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس کو کیا ہو گیا تھا۔

البتہ گیٹ پر اس کو عائزہ مل گئی جس کو وہ آج نہ جانے کیوں سارا دن بے چینی سے ڈھونڈتی رہی تھی۔

کہاں تھی تم! مہوش نے بہت اضطراری طور پر اس سے پوچھا۔

کیوں خیریت تو ہے؟ عائزہ نے پریشانی سے کہا۔

ہاں نہ جانے کیوں میں آج سارا دن تم کو تلاش کرتی رہی۔

ہاں آج میں ایک بہت ہی ضروری کام کی وجہ سے کالج دیر سے پہنچی۔

یہ کہہ کر اس نے مہوش کو بہت ہی غور سے دیکھا۔اس کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔یہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جو اسے اپنی والدہ کی آنکھوں اور ہونٹوں پہ نظر آئی تھی۔

یہ کیا ہو رہا ہے، اس نے دل میں سوچا، اس سے پہلے کہ وہ اس گتھی کو سلجھاتی، عائزہ نے ایک اور بم گرا دیا، آج میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں گی، میں نے اپنے والدین سے اجازت بھی لے لی ہے۔

کیا؟ اس کا سارا بدن پسینے میں شرابور ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اپنے کمرے کا سارا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔وہ ساری بے ترتیب کتابیں، وہ بیڈ شیٹ، وہ تکیہ غلاف، وہ الٹے سیدھے پڑے ہوئے جوتے، وہ بڑی سی ننگ دھڑنگ گڑیا جس سے وہ اب تک کھیلتی اور باتیں کرتی رہتی ہے اور حد یہ کہ وہ شب خوابی کا لباس جو وہ فرش ہی پر پٹخ آئی تھی۔یا اللہ یہ کیا ہونے جا رہا ہے؟ اس کو اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا جو کئی دنوں سے اس کے کمرے کو بھلا ہی بیٹھی تھیں۔

نہیں نہیں۔وہ بے خیالی میں بڑبڑا اٹھی۔

کیا نہیں نہیں، اس کی دوست نے سوال کیا۔

کچھ نہیں، کیا آج ہی تم کو میرے گھر جانا ہے؟ کل نہیں آسکتیں؟

کیوں آج کیا ہرج ہے اور دیکھو میں آج ہی جاؤں گی اور اب اگر تم نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو ساری دوستی ختم ہو جائے گی، سمجھیں!!

گھر آنے سے پہلے اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کو اپنے کمرے میں تو کبھی نہیں لے جائے گی، ڈرائنگ روم میں ہی بٹھائے گی۔

جب وہ گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی تو اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا، وہ اپنی حالت پر ابھی تک قابو نہیں پا سکی تھی۔دروازہ کھلا تو والدہ کا پورا چہرہ اسی پراسرار مسکراہٹ کی غمازی کر رہا تھا جو اس نے آج صبح دیکھی تھی لیکن اس کو ابھی اس کا کھوج لگانے کی فرصت کدھر تھی، اس نے بڑی عجلت میں ڈرائنگ روم کی جانب دوڑ لگانا چاہی لیکن قدم راستے میں ہی پتھر کے ہو گئے، وہاں سے اس کے والد کے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آواز کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی آ رہی تھیں، ابھی وہ خود بھی پتھر کی ہونے والی تھی کہ والدہ کی آواز آئی کہ اپنے کمرے میں جاؤ، جلدی سے حلیہ تبدیل کرو، آج کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں، چلو جلدی کرو۔اسے لگ رہا تھا کہ آج ہر چیز الٹ کر اس پر آن پڑی ہے، مہمان، کون مہمان......اپنے کمرے میں جاؤ، یہ بھی ٹھیک ہے لیکن وہ تو کباڑ خانہ ہے، اس کمبخت عائزہ کو بھی آج ہی آنا تھا، زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنی اس پیاری سی دوست کے لئے ایسا جملہ سوچا۔

چلو۔۔۔اس نے بہت کمزور سی آواز کے ساتھ عائزہ سے کہا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

یہ کیا؟ یا اللہ کہیں میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں، کمرا تو جھم جھم کر رہا تھا، ہر چیز اپنی جگہ نہایت سلیقے کے ساتھ رکھی تھی، اس کی وہ ننگ دھڑنگ گڑیا تو پری بنی اس کے بیڈ کے ایک کونے میں سجی اس کو مسکراتی نظروں سے دیکھتی محسوس ہوئی، اس نے گھبرا کے فرش کی جانب دیکھا جہاں وہ شب خوابی کے کپڑے پٹخ کر گئی تھی اب وہاں ایک چھوٹی سی میز جس کو وہ لات مار کر گرا کر گئی تھی بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔

وہ اپنے ساتھ آنے والی دوست کو جیسے بھول ہی گئی تھی، حیرت اور خوشی سے شاید وہ پاگل ہی ہو جاتی کہ عائزہ نے اس کو پکڑا اور آرام سے بیڈ پر بٹھا دیا اور کہا کہ جلدی کرو ابھی تو تمہارے لئے اس سے بھی بڑا سرپرائز ہے۔ چلو کپڑے تبدیل کرو۔

کیا مطلب؟

بتاتی ہوں، آج میں دیر سے کالج گئی تھی، یاد ہے ناں؟ دراصل میں آج تمہارے گھر ہی تھی۔ اس کمرے کو میں نے ہی سجایا تھا تاکہ تمہیں میرے آنے پر شرمندگی نہ ہو۔

سچ؟

بس سنتی جاؤ، میں تمہارے گھر کئی دنوں سے آرہی ہوں، آنٹی کے پاس...... میں اتفاقاً ایک تقریب میں ان سے ملی تھی۔ جب ان کو پتہ چلا کہ تم اور میں ایک دوسرے کی گہری دوست ہیں اور ایک ہی کالج میں زیر تعلیم ہیں تو انھوں نے تمہارے بارے میں اپنی پریشانی کا مجھ سے ذکر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تمہیں کالج میں کسی قسم کے مسائل کا سامنا ہے اس لیے آج کل پریشان سی رہتی ہو۔ میں نے ان کی تسلی کروائی اور کہا کہ میں اس کی اچھی دوست ہوں، میں ضرور اس سے اس کی الجھن کی وجہ معلوم کروں گی، آپ بے فکر رہیں۔ میں خود کچھ عرصے سے تمہارے بدلے ہوئے مزاج کو محسوس کررہی تھی۔ تمہاری امی چاہتی تھیں کہ کسی اچھی جگہ تمہارا رشتہ طے کردیں تاکہ تمہاری زندگی کی یہ خوشگوار تبدیلی تمہیں بھی بدل دے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناکہ میرا ایک بھائی بھی ہے اور ابھی حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کا آغاز کر چکا ہے، امی بہو کی تلاش میں تھیں، میں نے اپنی والدہ سے تمہارا ذکر کیا اور انہیں آنٹی سے ملنے کا کہا۔ جب میری والدہ تمہارے گھر پہنچیں تو دونوں خواتین ایک دوسرے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے پتھر کی بن گئی ہوں، میں ابھی حیران اور پریشان ہی ہورہی تھی کہ وہ دونوں گلے مل کر اس زور سے روئیں کہ ان کو اگر فرشتے بھی دیکھ لیتے تو وہ بھی رونے لگتے۔

یہ دونوں سگی خالہ زاد بہنیں تھیں جو ایک ریل کے حادثے میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ سفر کرتے ایک دوسرے سے جدا ہو گئی تھیں، خاندان والے تو دونوں کے شہید ہو گئے تھے، یہ بھی ایک دوسرے کو انہی شہیدوں میں شمار سمجھتی رہیں۔ اب اتنے سالوں بعد ایک دوسرے کو زندہ سلامت پا کر سوچو ان کی خوشی سے کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میری امی تو پہلے ہی اپنی بہن کا کنبہ دیکھ کر خوشی سے نہال تھیں، اور میری رائے تو یہ سب جاننے سے پہلے بھی تمہارے حق میں ہی تھی۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔ آج میں امی اور بھائی کو تم سے ملوانے کے لیے لائی ہوں، اور چاہتی ہوں کہ تم بھی بھائی کو دیکھ کر اپنی رائے بتاؤ۔ وہ ڈرائنگ روم میں موجود ہے، اگر وہ تم کو پسند آ گیا تو ہوسکتا ہے کہ ہم دو سہیلیاں اور وہ دو بہنیں ایک ہو جائیں۔

یہ ساری کہانی سن کر مہوش کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے......

لیکن...... وہ اس کو کیا کرتی کہ اس کے دل میں تو وہ معمولی شکل وصورت والا گھر کر چکا تھا جس کو وہ کئی دنوں سے کالج کے گیٹ پر کسی کا منتظر پاتی تھی۔

نہ جانے اس کے بہنے والی آنسوؤں کی لڑی اچانک کیوں رک گئی اور اس نے سوچ لیا کہ بہنوں بہنوں کا معاملہ اپنی جگہ، وہ بھی اسی کو تلاش کرے گی جو اس کے دل میں گھر کر چکا ہے، یہ سوچ کے اس نے الماری سے اپنی پسند کا لباس نکالا اور واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

وہ جب نہا دھو کے واش روم سے باہر آئی تو کمرہ خالی تھا، اس نے بھی سکون کا سانس لیا، خود کو ایک بار پھر اپنی رائے پر قائم کر کے وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کی امی اور عائزہ لاؤنج میں ہی اس کی منتظر تھیں۔ کچن میں کچھ خاطر داری کی چیزیں ہیں ڈرائنگ روم میں لیتی آنا، یہ کہہ کر وہ دونوں ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئیں۔ اس دوران وہ کافی نارمل ہو چکی تھی اور اپنے آپ کو اپنے فیصلے کے مطابق اٹل بھی کر چکی تھی۔

وہ کچن کی جانب بڑھی، بڑے اعتماد کے ساتھ اس نے مشروبات سے ٹرالی سجائی لیکن اس نے سوچا کہ پہلے خشک میوہ جات کی ٹرے اندر چھوڑ کر آئے، چنانچہ اس نے ٹرے اٹھائی، آنچل کو سنبھالا، سانسوں کو قابو میں کیا اور کسی حد تک اعتماد کے ساتھ ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

جونہی اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا اور سامنے بیٹھے نوجوان پر اس کی نظر پڑی، وہ ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گئی۔ خشک میوے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑی تھی اور وہ بت بنی ایک ٹک اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دل کا مکین تھا۔ ☆

ڈاکٹرممتاز عمر

ظالم کون؟

کالج میں اکثر اینٹی نارکوٹک فورس (ANF) کے ذمہ دار آیا کرتے تھے۔ بریگیڈیئر صاحب نے کہا کسی کو نشے کی لت سے چھڑانا بڑی ہی نیکی کا کام ہے۔ آپ لوگ ملک کے معماروں کی تربیت کرتے ہوئے انہیں نشہ آور اشیاء سے دور رہنے کی جو تلقین کر رہے ہیں وہ ہمارے مستقبل کو محفوظ بنائیگی۔ ہاں میری اتنی گذارش اور ہے کہ آپ اپنے اردگرد رہنے بسنے والوں کے اصلاح احوال کو بھی مقدم رکھیں اور جو لوگ بھی نشہ کی لعنت میں گرفتار ہو چکے ہیں انہیں اس مصیبت سے چھڑانے اور باعزت شہری بنانے کی کوشش بھی کریں۔ اس سلسلے میں آپ کو جس قسم کا تعاون درکار ہو ہم سے مل جائے گا۔ اگر کوئی بھی نشہ چھوڑنے پر آمادہ ہو تو ہم اس کو علاج کی مکمل سہولیات دینے اور معاشرے میں بحالی کے لئے ہر ممکن تعاون کریں گے۔

بریگیڈیئر صاحب کا موقف جاننے کے بعد میرے خیالات عدنان کی طرف مرکوز ہوکر رہ گئے۔ یہ میرے سامنے کا بچہ تھا مگر کسی موقع پر نشہ کرنے والوں میں بیٹھنے اٹھنے لگا گھر والوں کو اس کے اس گھناؤنے فعل کا اندازہ اس وقت ہوا جب ہیروئن کا نشہ اس کے رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔ جب نشہ ٹوٹتا وہ بڑا بے چین اور مضطرب ہو جاتا گھر کی چیزیں اٹھا کر بیچنے اور رقم کو ہیروئن میں اڑا دینا اس کا معمول بن گیا۔ جب گھر والوں نے سختی کی تو وہ محلے کے گھروں کے برتن چرا کر بیچنے اور اپنے نشہ کو پورا کرنے لگا۔ محلے کے سب لوگ پریشان تھے کوئی سلمان سے شکایت کرتا تو وہ بیچارہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ رہی بدقسمت ماں تو اس نے کبھی پیار سے چپل اور کبھی جھاڑو سے مار کر اسے غیرت دلانے کی کوشش کی وہ نشہ کی حالت میں ہوتا تو ماں سے معافیاں مانگتا اور آئندہ نشہ نہ کرنے کا وعدہ بھی کرتا مگر جب نشہ ٹوٹنے لگتا تو وہ اپنے ہوش وحواس سے عاری نشہ پورا کرنے کے سوا کچھ اور نہ کر پاتا۔ اس موقع پر اگر اُسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو بے سود ثابت ہوتی نشہ ٹوٹنے کی کیفیت اس طرح بیان کرتا تھا جسم بری طرح ٹوٹنے لگتا ہے خون کی رگوں میں چیونٹیاں چلتی ہیں آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے اور میری بے چینی مجھے کسی پل چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تاوقت کہ ہیروئن مل جائے۔

میں نے ایک روز سلمان سے کہا کہ ہمارے کالج میں افتخار صاحب آتے ہیں وہ اے، این، ایف (ANF) سے وابستہ ہیں اگر عدنان نشہ چھوڑنے پر رضا مند ہو تو ہر قسم کے علاج معالجے سے لے کر اس کی مکمل بحالی پر تعاون کے لئے آمادہ ہیں ان کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ جس پر وہ بولا بھائی ہم نے تو ہر کوشش کر دیکھی اسے گھر میں بند رکھا زنجیروں سے باندھا کچھ علاج بھی کرایا مگر جونہی وہ گھر سے باہر گیا پھر نشہ کر کے ہی لوٹا۔ میں نے کہا ممکن ہے ہسپتال میں علاج دیرپا اور مکمل ہوتا ہو، نفسیاتی طور پر بحالی کی کوشش بار آور ثابت ہو۔ بولا میں اُسے ڈھونڈ کر لاتا ہوں پھر اس سے بات کر دیکھتے ہیں۔

شام کے وقت سلمان کے پڑوسی سلیم صاحب مجھے بلانے آئے میں ان کے ساتھ ہولیا۔ سلمان کے گھر پہنچے تو عدنان بھی موجود تھا۔ میری اطلاع پا کر ان کی والدہ آئیں میں نے گفتگو شروع کی تو عدنان زارو قطار رونے لگا بولا بھائی جان میں تو خود چاہتا ہوں کہ نشہ کی لعنت سے چھٹکارا پاؤں میری وجہ سے سب گھر والے شرمندہ ہوتے ہیں اور مجھے کوئی ساتھ نہیں بٹھاتا بلکہ اگر میں کسی کے پاس کھڑا ہوں تو وہ اپنی جیب پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ سسکیاں لینے لگا اچانک وہ میرے پیر پکڑ کر بولا مجھ پر رحم کریں زہر لا کر دے دیں یا پھر میرا مکمل علاج کروا

دیں تاکہ میں بھی اچھا انسان بن جاؤں۔ حالات سازگار تھے، میں نے موبائل نکال کر افتخار صاحب سے رابطہ کیا پتہ سمجھایا اور کوئی دس پندرہ منٹ میں ایمبولینس ان کے دروازے پر کھڑی تھی۔ عدنان اور سلمان اس میں بیٹھے تو ان کی ماں نے بہت سی دعائیں دیں۔ دو گھنٹے بعد سلمان واپس آ گیا اس نے بتایا کہ عدنان کو ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے وہاں بہت اچھے انتظامات ہیں ہسپتال والوں نے کہا ہے کہ تین سے پانچ ہفتوں میں یہ نارمل ہو جائے گا۔ ملاقات کے لئے لوگ زیادہ نہ آئیں تو بہتر ہے آپ بھی دو تین دن میں ایک آدھ بار آئیں۔ بحالی کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد عدنان گھر واپس آ گیا ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق اس کی سخت نگرانی شروع ہوئی۔ بلاضرورت گھر سے نکلنے نہیں دیا گیا اور پھر باہر آنا جانا شروع ہوا تو گھر کے اور دیگر معتبر افراد کے ذریعے غیر محسوس انداز میں نگرانی جاری رہی۔ خود اس میں بھی خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ پرانے نشئی دوستوں میں سے کوئی علیک سلیک کرتا تو وہ اس سے جلدی جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ناصر اُسے تقریباً پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ہم اتنے برے ہیں کہ تم بات تک نہیں کرتے جس پر وہ بولا کہ میرے گھر والوں اور ڈاکٹروں نے بڑی محنت کی ہے کہ ڈرتا ہوں تمہاری صحبت میں پھر پرانی ڈگر پر نہ چل پڑوں جس پر ناصر نے کہا، یار ہم تو خود اس لت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں، ہمیں بھی راستہ بتا جس پر اس نے کہا کہ سلمان بھائی سے بات کرو اور مجھے چھوڑ دو کوئی دیکھ لے گا تو بلاوجہ شک کرے گا۔ اس دوران عدنان کی نظر مجھ پر پڑی تو شرمندہ سا ہو کر بولا یہ مجھے نہیں چھوڑتا۔ مجھے دیکھتے ہی ناصر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

چھ ماہ گزرنے کے بعد جب ہم سب کو یقین ہو چلا کہ عدنان اب نشہ کی برائی سے مکمل طور پر چھٹکارا پا چکا ہے تو ہم نے ایک بار پھر اسے عملی زندگی میں قدم رکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ ملازمت کی تلاش میں ایک سے دوسری پھر اگلی فیکٹری اور کمپنی کے چکر لگانے لگا۔ جہاں جاتا اس کا ماضی اس سے پہلے وہاں پہنچ کر اس کے مستقبل کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتا۔ پھر اس نے محلے کی دکانوں میں سیلز مین کے طور پر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی اسے کام پر رکھنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ میں نے اور سلمان نے کئی جگہ خود جا کر یقین دلایا کہ عدنان اب نشہ چھوڑ چکا ہے تو کئی ایک نے یہ کہہ کر کہ کب دوبارہ شروع کر لے اور دیگر نے کوئی اور بہانہ کر کے ٹال دیا۔ آخر کار اس نے مزدوروں کے اڈے پر بیٹھنا شروع کیا لیکن یہاں بھی ایک دو دن کام ملتا تو ہفتہ بھر بے روزگار رہنا پڑتا۔ ہوتا یوں تھا کہ کوئی نہ جاننے والا اسے لے جاتا مگر کام کرتا دیکھ کر کوئی نہ کوئی جاننے والا صاحب خانہ کو اس کے ماضی سے آگاہ کر دیتا اور وہ شام کو اس کی اجرت دے کر فارغ کر دیتا۔

ہمارے گھر تقریب سجی تھی۔ میں کسی ضرورت سے باہر نکلا تو عدنان ایک طرف سر پکڑے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا، کہنے لگا تھیلی میں تھوڑا سا سالن اور روٹی دے دیں تاکہ میں بھی پیٹ بھر لوں۔ میں نے کہا تھیلی میں کیوں پلیٹ میں لے کر کھاؤ، بولا مجھے اپنے ساتھ کون بٹھاتا اور کھلاتا ہے کوئی اعتبار ہی نہیں کرتا ہر ایک سمجھتا ہے کہ میں چور اچکا ہوں۔ وہ یہ کہتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا اور پھر روتے ہوئے بولا، سلمان بھائی اور آپ نے مل کر میری زندگی تباہ کی ہے۔ مجھے ہیروئن پینے دیتے کچھ دن میں تو میں مر ہی جاتا پاپ تو کٹتا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، میں نے سب کچھ چھوڑ دیا مگر معاشرہ میرے ماضی کو بھلانے کو تیار نہیں۔ گھر جاتا ہوں تو ماں اور بھابھی طعنے دیتی ہیں۔ مزدوری کی تلاش میں ناکام رہتا ہوں۔ آپ دونوں نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

یہ سن کر میں اچنبھے میں آ گیا خود کو اس کا مجرم سمجھتے ہوئے میں نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا۔ تقریب سے فارغ ہو کر میں نے بریگیڈیئر افتخار کو فون کر کے عدنان کی موجودہ کیفیت سے آگاہ کر کے مدد چاہی۔ انہوں نے اگلے روز دفتر آنے کا مشورہ دیا۔

جب میں نے تفصیل سے انہیں بتایا کہ عدنان نے نشہ تو چھوڑ دیا مگر اس کا ماضی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ملازمت سیلز مینی اور مزدوری تک ناکامی کا تذکرہ کیا تو بولے، بات تو ٹھیک ہے مگر ہمیں تو یہ ہی ٹاسک

دیا گیا ہے کہ لوگوں کو نشہ چھوڑنے میں مدد دیں اور نشہ آور اشیاء کی خرید وفروخت اور اسمگلنگ کو روکنے کی کوشش کریں۔ میں نے کہا مگر یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے نشہ چھوڑ کر جب انہیں محنت مزدوری ہی نہیں ملے گی تو وہ اچھے شہری کیسے بنیں گے۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے اثر ورسوخ یا حکومتی ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے ایسے لوگوں کو برسرروزگار کرائیں۔

میرے اس جواب سے وہ لاجواب سے ہوئے اور یہ کہہ کر مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے شریفانہ انداز میں مجھ سے رخصت چاہی۔ وہاں سے اٹھ کر گھر آتے ہوئے ناامیدی مجھ پر غالب تھی رہ رہ کر عدنان کے یہ الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے کہ سلمان بھائی اور آپ نے مجھ پر ظلم کیا۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ عدنان سے سامنا ہوا تو میں نظریں چراتے ہوئے اس سے ملنے سے کتراتے ہوئے کسی طرف کو ہو لیتا۔

بریگیڈیئر سے ملاقات کے دس دن بعد صبح کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ مسجد سے یہ اعلان ہوا کہ سلمان کا بھائی عدنان انتقال کر گیا ہے اس کی نماز جنازہ ظہر کے بعد ہوگی۔ سن کر میں پہلے سلمان کے گھر پہنچا موت کی وجہ جانی تو معلوم ہوا کہ رات اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔

عدنان کی اس اذیت ناک اور المناک موت کی خبر سن کر مجھے شدید صدمہ ہوا۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور کالج نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ توقف کے بعد سلمان گھر سے باہر نکلا۔ میں کھڑے ہو کر اس سے گلے ملا بہت کچھ کہنے کے لئے الفاظ جمع کئے اور کچھ نہ کہہ پایا۔ سلمان نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا، نگاہوں نے پیغامات کا تبادلہ کیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر میں لے گیا۔ صحن میں چادر میں لپٹی چارپائی پر اس کی لاش موجود تھی۔ چہرہ دیکھنے کے لئے چادر ہٹائی تو میں پیچھے کو ہوا کیوں کہ عدنان کی آنکھیں اور منہ کھلا تھا یوں لگتا تھا کہ وہ ہم دونوں سے کچھ کہہ رہا ہو، کہ تم نے میرے ساتھ ظلم کیا۔ میں نے جلدی سے چادر اس کے چہرے پر ڈال دی۔ ماں اور بہن کے بین کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ملازمت میں بار بار کی ناکامیوں نے اسے مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا اور اس نے قبر کی گود میں جا کر سکون پانے کی آخری کوشش کر ڈالی تھی۔☆

☆......☆......☆

سیر و سیاحت
آخری قسط

صائمہ اسما

نیویارک میں چند روز

کیا کھائیں؟

یہاں بارش میں خوشبو نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے کہ یہاں مٹی نہیں ہوتی۔ پھلوں میں ذائقہ اور خوشبو ناپید ہے۔ دودھ مصنوعی اور بدمزہ ہے۔ چکن کو جتنا پکاؤ اتنا سخت ہوتا جاتا ہے۔ دم والی چائے کے لیے کھلی پتی نہیں ملتی۔ ہم جیسے مسافروں کے لیے کھانا پینا ایک دکھی معاملہ ہے۔ کہیں کہیں حلال فوڈ کے ٹھیلے نظر آتے ہیں مگر یہ کھانا روز نہیں کھایا جا سکتا۔ یہاں رہنے کے لیے قدرتی چیزوں کی بجائے مصنوعی چیزوں کا مزا لینا سیکھنا پڑتا ہے، پیکیجڈ غذاؤں کے ذائقے سے دوستی کرنی پڑتی ہے۔ ہر چیز پیکٹ میں، ہر غذا ڈبے میں بند ملے گی۔ غذائیت اور بیماریوں کے تعلق پر انتہائی جدید تحقیق سے دنیا بھر کو روشناس کرانے والی قومیں خود اپنے شہریوں کو کیا کھلا رہی ہیں، یہ کمرشل ازم میں جکڑے ہوئے اس معاشرے کو دیکھ کر سمجھ آتی ہے اور عبرت بھی ملتی ہے۔ ہم غریب سہی مگر ابھی تک قدرتی غذاؤں سے اتنے دور نہیں ہوئے۔

اب اتنے زیادہ خالی پیکٹوں، لفافوں اور ڈبوں کا کیا ہو؟ اسی لیے کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے کا بندوبست یہاں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہر جگہ دو بلکہ تین تین بھی کوڑے دان رکھے ہوئے ہیں جن میں کوڑے کی درجہ بندی کی گئی ہے اور اس درجہ بندی کی خلاف ورزی کرنے والے کے لیے جرمانے کا اعلان ہے۔ میں نے تو چلتے چلتے کبھی ٹشو پیپر بھی ان میں نہ پھینکا مبادا غلط بِن میں جا پڑے۔ کوڑے دانوں کا کوڑا سڑکوں کے کنارے بڑے بڑے کالے لفافوں میں لپٹا اکٹھا ہوتا رہتا ہے جس کو مقررہ وقتوں پر گاڑیاں اٹھا لیتی ہیں۔

ان سارے انتظامات کا سیدھا سا نتیجہ یہ ہے کہ شہر صاف رہتا ہے۔ دنیا کا مصروف ترین کاروباری اور سیاحتی مرکز ہونے کی بنا پر اتنے لوگوں کی نقل و حرکت اور آمد و رفت کے باوجود شاذ و نادر ہی کہیں کوئی گند نظر آتا ہے۔

میٹرو سب وے

میرے خیال میں نیویارک کی سب سے دلچسپ چیز میٹرو سب وے ہے۔ یہ عوام کی جگہ ہے۔ یہاں آپ شہر اور لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ آپ جتنی دیر چاہیں میٹرو سٹیشن کے اندر گھومتے رہیں، ٹرین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کریں، ہر بار آپ کچھ نہ کچھ نیا سیکھتے اور دیکھتے ہیں۔ امریکی کلچر یہاں پوری طرح عیاں ہے۔ گا بجا کر مانگنے والے جگہ جگہ ڈیرہ جمائے ہوتے ہیں۔ سنیاسی بابا ٹائپ کردار بھی گلے میں مالائیں پہنے کتابچے سجائے نظر آئیں گے۔ ہر طبقے کا شخص یہاں ملے گا۔ کمپنیوں کے سوٹڈ بوٹڈ افسر، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، کاروباری افراد، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بچے اور نوجوان، معمولی ملازمتیں کرنے والے محنت کش، ہر عمر رنگ اور نسل کے لوگ......ایک جیسا کرایہ دے کر ایک ہی جیسے ڈبوں میں ایک ہی وقت سوار ہوتے ہیں، بیٹھنے کی جگہ مل گئی تو بیٹھ گئے ورنہ کھڑے ہیں۔ صرف معذوروں کے لیے چند نشستیں مخصوص ہیں جو انہیں ترجیحاً دی جاتی ہیں۔

عوام کی ایک کثیر تعداد ذاتی ذرائع ہونے کے باوجود میٹرو کے سفر کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ یہ ذریعہ سستا بھی ہے، سریع بھی اور ڈرائیونگ کی مشقت سے بھی بچاتا ہے۔ صبح شام رش کے اوقات میں اور بعض مصروف سٹیشنوں پر ہر وقت اتنے زیادہ لوگ ہوتے ہیں کہ پلیٹ فارم تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

قانون کی پابندی کے حوالے سے چند باتیں بے حد متاثر کن تھیں۔ مثلاً ٹرین کا دروازہ کھلنے کے بعد جب تک آخری نکلنے والا باہر

نہیں آجاتا، باہر کھڑے ہجوم میں سے کوئی اپنا قدم نہیں بڑھاتا بے شک ایک جمِ غفیر باہر کھڑا ہو۔اندر داخل ہوتے ہوئے دھکم پیل نہیں ہوتی، سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کھینچا تانی کا کوئی سوال نہیں۔ایک کو بڑھتا دیکھ کر دوسرا خود پیچھے ہو جاتا ہے۔سب سے اہم بات یہ کہ جسمانی طور پر ایک دوسرے سے محتاط فاصلہ برقرار رکھا جاتا ہے خواہ آپ کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے میں کیوں نہ کھڑے ہوں، حالانکہ یہاں ہر پس منظر کے لوگ موجود ہوتے ہیں اور عورتوں مردوں کے الگ ڈبے بھی نہیں ہیں۔ ایسی جگہوں پر ہمارے ہاں تو اکیلی خاتون سفر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔وجہ یہ کہ ان کے ہاں پبلک مقامات پر ہر شخص کی جسمانی حدود کے احترام پر قوانین موجود ہیں جن پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔گویا محض قانون پر عملدرآمد کے ذریعے ایک قوم کی اسطرح کے معاملات میں بھی تہذیب کی جا سکتی ہے!!

لوگوں کی خواہشات قانون کی شکل میں ڈھلتی ہیں، یا قانون اور معاشرتی ادارے افراد کے رویوں کی تشکیل کرتے ہیں، اس نکتے پر فلسفیوں میں بڑی لمبی بحثیں موجود ہیں۔ جدید برطانوی مفکر انتنی گڈنز کے اس خیال نے خاصی پذیرائی پائی ہے کہ یہ فرد اور معاشرے کا مسلسل اور دوطرفہ تعامل (Structuration) ہے جو ایک سوسائٹی کی صورت گری کرتا ہے (۷)۔لوگوں کی زندگیوں میں موجود قدروں کو معاشرتی نظام میں ڈھالا جاتا ہے، پھر یہ مجموعی نظام آنے والی نسلوں کی اقدار بناتا ہے۔ امریکی قوم اب اس مرحلے پر ہے کہ بہت سے معاملات میں قانون انفرادی رویوں کی تہذیب میں ڈھل گیا ہے۔یہی ان کی خلاقیات ہے۔ البتہ اس اخلاقیات کا پھیلاؤ اور ظرف چونکہ الہامی اخلاقیات کی نسبت بہت محدود ہے، اس لیے یہ ہر دائرے میں اپنا مکمل اثر دکھانے سے عاجز ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج عورت سب سے زیادہ غیر محفوظ بھی اسی معاشرے میں ہے۔ ہراسیت، ریپ اور گھریلو تشدد پر خود امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹیں لرزا دینے والی ہیں۔کم عمر بن بیاہی ماؤں کی کثرت ہے جو اپنے ساتھ اپنے بچے کا بوجھ بھی ڈھوتی ہیں۔رویوں کی اصلاح میں خوفِ خدا کے تصور کا چونکہ کہیں گزر نہیں، اس لیے شدید خواہش کے آگے بند باندھنے یا حیوانی فطرت کا راستہ روکنے میں قانون بے بس دکھائی دیتا ہے۔مذہب کے کردار کو تو اہلِ مغرب نے بہت پہلے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔اب تو خود ہی ٹھوکریں کھاتے ہوئے سیدھے راستے تک پہنچنا ہے، چاہے صدیاں اور لگ جائیں!

مس کیلی کا اعتراف

اس قیام کے دوران چند لوگ جن سے مختصر ملاقات ہوئی مگر وہ یادداشت کا حصہ بن گئے۔ چرچ سنٹر میں ملنے والی گرے بالوں والی باوقار سی نیویارک کی سفید فام خاتون مس کیلی، ایک عمر امریکی اداروں میں پبلک پالیسی پڑھاتی رہی تھی اور اب اپنے معاشرے میں استاد کے احترام کی قدر زوال پذیر ہونے پر دکھی تھی۔تعارف کے بعد اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا، گہری نگاہوں سے کچھ دیر دیکھتی رہی، پھر شکستہ لہجے میں بولی ''میں بے حد شرمندہ ہوں......اس سلوک پر جو میرا ملک تمھارے ملک کے ساتھ کر رہا ہے''۔

اس کے لہجے کے دکھ نے مجھے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ بس اس کے ساتھ ایک تصویر بنوائی اور اس کی اس جرأتِ اظہار کو ایک تحفہ سمجھا۔

پروفیسر گٹلن

ٹوڈ گٹلن، کولمبیا یونیورسٹی کے سکول آف جرنلزم میں پی ایچ ڈی پروگرام کا سربراہ۔ یہ ڈیپارٹمنٹ میرے روزانہ کے راستے میں پڑتا تھا۔میں فیلوشپ پروگرام کے امکانات جاننا چاہتی تھی۔ ویب سائٹ سے ایڈریس دیکھ کر ای میل کیا کہ میں پاکستان سے آئی ہوں اور اس غرض سے ملنا چاہتی ہوں۔اس نے فوراً دو دن بعد کا وقت دے دیا اور آفس سمجھا دیا۔میں نے اس خیال سے کہ اتنا سینئر پروفیسر ہے، دوبارہ پوچھا کہ آپ کے دفتر تک پہنچنے کے لیے کوئی تکلفات جو پورے کرنے ضروری ہوں۔ جواب آیا کہ نہیں بس آجاؤ۔میں وقت سے پانچ منٹ پہلے پہنچ گئی اور ہر طرف کھلے دروازوں سے ہوتی ہوئی سیدھی دفتر تک چلی آئی۔انتظار گاہ میں چند منٹ گزرے ہوں گے کہ پورے وقت پر پروفیسر پہنچ گئے۔تسلی

سے بیٹھے، گپ شپ لگائی، نیویارک کے بارے میں رائے پوچھی، میرے سب سوالوں کے جواب دیے اور جب میں نے خود اجازت چاہی تب اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اس دوران دروازے پر آ کر کسی نے مداخلت کی تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ایک سینئر استاد کے احساسِ ذمہ داری، آسان رسائی اور پابندیِ وقت نے مجھ پر گہرا تاثر چھوڑا اور اپنے ہاں تعلیمی ماحول کے بہت سے پہلوؤں پر شرمندہ بھی کیا۔

کچھ عرصہ بعد تھیوری کی ایک کتاب میں کسی نظریے پر اس نام کا حوالہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ''.....تو وہی ہے یا کوئی اور ہے''۔ نام سرچ کیا، معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ وہی ہیں بلکہ موصوف شاعر، ناول نگار، کئی کتابوں کے مصنف اور ابلاغ عامہ کے علوم پر ماہر کا درجہ رکھتے ہیں۔

لزا، یان یو اور جولیا

امپائر سٹیٹ کے سیکنڈ فلور پر ٹکٹ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لزا جس کا تعلق افریقی ملک گیانا سے تھا مگر جو برسوں پہلے نیویارک آ کر بس گئی تھی۔ ٹکٹ کی قیمت اچھی خاصی تھی، سن کر میں نے کہا، یو این کانفرنس ڈیلی گیٹ کے لیے کوئی خصوصی رعایت؟ وہ مسکرا کر بولی، مَیم! میرے بس میں ہوتا تو ضرور کر دیتی۔ پھر پوچھنے لگی، کل کچھ اور خواتین بھی وہاں سے آئی تھیں، یہ کیسی کانفرنس ہے؟ وہ دلچسپی رکھتی تھی، مزید سوالات پوچھنے لگی۔ ان دنوں پاکستان کے بارے میں ایک خبر گردش میں تھی۔ میں نے کہا، بدقسمتی سے بین الاقوامی میڈیا پاکستان کے بارے میں ہمیشہ منفی خبریں ہی نمایاں کرتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کی جدوجہد بہت اچھی بات ہے مگر آپ نیویارک میں بیٹھ کر پاکستانی عورت کا غم نہیں کھا سکتے جب تک آپ ہمارے ماحول کے مسائل کو نہ جان لیں۔ وہ خود یہی محسوس کرتی تھی اس لیے میرے موقف پر بہت خوش ہوئی۔ پھر بادلوں کی وجہ سے اوپر جانا تو ممکن نہ ہوا، میں نے کہا، لزا! میں شاید اتنی سیڑھیاں چڑھ کر یہاں تک صرف اس لیے پہنچی تھی کہ تم سے بات چیت کر سکوں۔ وہ بھی ہنس دی اور میں واپسی کے راستے کی بھول بھلیوں میں گھس گئی۔

یان یو، وہ پیاری سی چینی لڑکی جس کے ساتھ میں ایک رات سٹیشن سے وٹیئر ہال اپنے ٹھکانے تک چلی تھی۔ مووی سکریننگ سیشن کے بعد میں آج خاصی تاخیر سے نکلی تھی۔ ریڈ وَن اس رات کولمبیا پر رکی ہی نہیں۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مین ہیٹن کے کنارے پر واقع اس علاقے سے کچھ ہی آگے برونکس شروع ہو جاتا ہے جو جرائم کی شہرت رکھتا ہے۔ اگلے سٹیشن پر اتر کر پیدل واپسی کا سفر شروع کیا جبکہ رات گہری ہو گئی تھی، بارش تھی اور سڑکیں ویران۔ میرے ساتھ ہی یہ چینی لڑکی اتری تھی، کولمبیا کی سٹوڈنٹ اور اتفاق سے ہوسٹل بھی میرے ٹھکانے کی طرف۔ اب سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ اس سفر کی ایک پلاننگ تو میں نے کر رکھی تھی اپنے مادی سہاروں کو استعمال کر کے......جہاں جہاں اس میں جھول تھے، بے یقینیاں تھیں، رکاوٹیں تھیں.....وہاں وہاں کی ایک تفصیلی پلاننگ اللہ میاں نے میرے لیے کر رکھی تھی۔ سو اُس رات میرے لیے اس لڑکی کے ساتھ کا بندوبست تھا۔ چالیس منٹ کا سارا راستہ ہم باتیں کرتے آئے اور فاصلے کا پتہ بھی نہ چلا۔

اپارٹمنٹ میں میں ''نیڈ از فرینڈ'' کہلاتی تھی۔ ہر لڑکی کے آنے جانے، کھانے پینے کا اپنا اپنا وقت تھا اس لیے ہڑبونگ کا منظر کسی وقت بھی نہ ہوتا۔ ندا کی روم میٹس میں سب سے خوش اخلاق اور مہمان نواز وہ چینی لڑکی تھی جس کا اصل نام تو مشکل سا تھا مگر خود کو جولیا کہلواتی تھی۔ بہت سے چینی بچوں کی طرح ماں باپ کی اکلوتی اولاد اور اپنے ملک کی ایک خاندان ایک بچہ کی پالیسی سے تنگ......مگر پُر امید کہ یہ پالیسی نرم ہو جائے گی۔ پہلے دن صبح مجھے چائے ''زہر مار'' کرتے دیکھ کر خاصی پریشانی سے پوچھنے لگی، آپ کے پاس ناشتے کے لیے کچھ ہے؟ میرے پاس جو تھا اسے دکھا دیا اور یوں اس سے دوستی ہو گئی۔ یو این سوونیئر شاپ سے اس کے لیے کچھ لینا چاہا، ایسا جس پر ''میڈ ان چائنا'' نہ لکھا ہو مگر خاصی تلاش کے باوجود ناکامی ہوئی، سو اسی کے ملک کا بنا ہوا قلم اس کو تحفے میں دیا۔ میں ایک دن تھکی ہاری واپس پہنچی تو دروازہ بند تھا۔ نیچے لابی میں بیٹھ کر اس کو فون کیا۔ کہیں بازار میں تھی، کچھ دیر بعد ہانپتی ہوئی لفافے اٹھائے واپس پہنچی اور میرا داخل ہونا ممکن کیا۔ آخری

دن ندا نہیں تھی، وہ میرا بیگ گھسیٹتی ہوئی نیچے تک میرے ساتھ آئی اور گلے لگ کر رخصت کیا۔ پردیس میں کسی اجنبی سے اتنی اپنائیت مل جانا بغیر کسی غرض کے، بہت اچھا لگا۔ جولیا ڈیئر! جہاں رہو خوش رہو۔

اسرائیل کے خلاف قرارداد

آخری میٹنگ سیشن کا تجربہ لکھے بغیر یہ داستان ادھوری رہے گی۔ فلسطینی عورتوں کی حالتِ زار اور ان کی مدد کے عنوان سے ایک قرارداد پیش کرنا اس دن کا سب سے اہم نکتہ تھا۔ چین، جی ۷۷ کے مما لک اور ساؤتھ افریقہ کی طرف سے لائی گئی اس قرارداد کے متن میں اسرائیل کو فلسطینی عورتوں کے تمام مسائل کی جڑ قرار دیا گیا تھا۔

متن پڑھا جانے کے بعد اس پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ یورپی یونین کی طرف سے ولندیزی نمائندہ کا خیال تھا کہ یہ قرارداد کمیشن کی بجائے جنرل اسمبلی کے دائرہ کار سے متعلق ہے لہٰذا وہیں پیش ہونی چاہیئے، اور اسی بنیاد پر اس نے یونین کے رائے شماری سے باہر رہنے کے فیصلے کا اعلان کیا۔ اسرائیل کی مندوب تو جو بھی کہتی کم تھا، بلکہ اس کا انداز اور بعض الفاظ آدابِ سفارتکاری سے میل بھی نہ کھاتے تھے۔ لبِ لباب یہ تھا کہ یہ قرارداد اسرائیل کے خلاف بغض پر مبنی ہے، دراصل فلسطینی عورتوں کے حقوق کے غاصب خود حماس کے لوگ ہیں اور ان کی دہشت گردی ہے۔

رائے شماری ہوئی اور بیالیس میں سے ستائیس ووٹ حق میں لے کر قرارداد منظور ہوگئی۔ مخالفت میں صرف اسرائیل اور امریکہ کے دو عدد ووٹ تھے۔ امریکی مندوب نے اسے اسرائیل کو تنہا کرنے کی کوشش قرار دیتے ہوئے قرارداد کی مخالفت میں رائے دینے کا دفاع کیا۔ جاپان کے نزدیک متن غیر متوازن تھا لہٰذا اس نے ووٹ سے پرہیز کیا۔

فلسطینی مندوب نے ایوان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جامع خطاب کیا، اسرائیلی جارحیت کی پانچ دہائیوں میں فلسطینیوں کے ساتھ روا رکھے گئے غیر انسانی اور اہانت آمیز سلوک کا مختصر تذکرہ کیا، فلسطین کی محصور آبادی کے خلاف اسرائیل کے سنگین جنگی جرائم پر بات کی اور کہا کہ فلسطینی عورتیں کیسے اپنے حقوق پا سکتی ہیں جبکہ اسرائیل ایک قوم کی آزادی کا حق غصب کیے بیٹھا ہے، نیتن یاہو کے تازہ بیان کا حوالہ دیا کہ فلسطین نامی ریاست کا وجود ہی ناقابلِ برداشت ہے۔ ایران کی مندوب نے اپنی تقریر میں کہا کہ دنیا میں عورتوں کے حقوق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ غیر ملکی غاصبانہ تسلط ہے جو عورتوں کی زندگی سے سکون اور چین رخصت کر دیتا ہے۔ جب تک دنیا میں بدامنی، استعمار کی مسلط کردہ جنگیں اور ملکوں کی خودمختاری پر حملے نہیں ختم ہوں گے، عورتیں ظلم سے نجات کی کوئی ضمانت نہیں پا سکتیں۔

کشمیری عورت.......اے دنیا کے منصفو!

عورت اور مسلح تصادم اس ایکشن پلان کے بنیادی نکات میں شامل ہے۔ کئی مین سیشن اور سائڈ ایونٹ اس حوالے سے ہوئے۔ تنازعات، جنگوں اور غیر ملکی تسلط میں عورتیں اور بچے جو کچھ سہتے ہیں، آج کی مہذب دنیا میں یہ سب ہوتا دیکھ کر روح لرز جاتی ہے۔ مگر گزشتہ بیس برسوں میں حالات بہتر تو کیا ہوتے، سفاکیت اور درندگی کے نئے ریکارڈ قائم ہوئے۔ خود عورت کو براہِ راست ظلم کا نشانہ بنایا جائے، اس کے بچوں پر ظلم کیا جائے یا اس کے شوہر اور دیگر کفیل مردوں کو مارا یا گرفتار کیا جائے، یہ سب عورت ہی پر ظلم کی شکلیں ہیں۔

عورت کے حقوق دلوانے پر غور و فکر کرنے والا یہ تمام پروگرام حسبِ سابق اور حسبِ توقع کشمیری عورت کے محض تذکرے سے بھی محروم رہا، جہاں بنتِ حوا محض اپنے حق خود ارادی کے تقاضے کی پاداش میں ہزاروں کی تعداد میں بے عصمت ہوئی ہے۔ پاکستان میں انہیں صرف ملالہ نظر آئی۔ کمیشن (CSW) کے رہنما اصولوں میں پہلا اصول یہ ہے کہ زبان، رنگ و نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر دنیا بھر میں عورتوں کی بہتری کے لیے کام کیا جائے گا۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ عالمی طاقتوں کے سیاسی مفادات سے ہٹ کر شاید ہی اس فورم پر کوئی فیصلے ہوئے ہوں۔

موسم بہار کی برفباری

صبح تک دھوپ چمک رہی تھی، اب واپسی کا قصد کیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ لابی کے شیشوں سے باہر دور تک برف کے نرم گالے گر رہے ہیں۔ کہاں تو نیویارک والے بیچارے آمد بہار کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے، یہاں تک کہ گرم کپڑوں کی سیلیں بھی ختم ہو چکی تھیں، اور آج پھر برف پڑ

گئی۔ جیسے ہمارے ہاں گرمی جان ہی نہیں چھوڑتی، پلٹ پلٹ کر حملہ کرتی ہے، اسی طرح وہاں سردی کا موسم عزت سے جانے کو تیار نہیں ہوتا۔

میں مبہوت سی ہو کر دیکھتی رہی۔ پھر ہمت کر کے باہر قدم رکھے، گیٹ پر پہنچ کر مڑی، عمارت پر چند لمحے طویل ایک الوداعی نظر ڈالی اور پھر اپنے راستے پر چل دی۔ یاسمین کا فون آ گیا تھا کہ مین ہیٹن کی طرف آنے والی شاہراہیں برفباری کے باعث بند کر دی گئی ہیں، لہٰذا اب وہ آج مجھے لینے کی بجائے کل ائر پورٹ چھوڑنے کے لیے ہی آ سکیں گے۔ میرے ان میزبانوں نے مجھے پردیس میں اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔

آج ٹائم سکوئر پر اتر کر بچوں کے لیے کچھ شاپنگ کا ارادہ تھا۔ برف باری میں اب بارش بھی شامل ہو گئی تھی، اوپر سے میری ناک اور آنکھوں سے بھی مسلسل پانی بہہ رہا تھا اور ٹھنڈک سے بچنے کے لیے میں نے منہ پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ اسی ہیئت کذائی میں چند دکانیں پھریں، واپس پہنچ کر پیکنگ مکمل کی، مٹھی بھر کر دوائیاں کھائیں اور بے سدھ ہو گئی۔

امریکہ امریکہ!!

صبح اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو ہر چیز نے برف کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ نیچے ایپل ٹری مارکیٹ کی چھت برف کے بوجھ سے دبی پڑی تھی۔ رات بھر اتنی برفباری ہوئی تھی کہ درختوں کی برہنہ شاخوں پر بھی برف کی موٹی تہہ تھی۔

گھر واپسی کی خوشی میں آج ایک عجیب سی اداسی شامل ہو گئی تھی۔ یہ آخری دن میں نے زیادہ تر وقت کھڑکی سے باہر نیچے دیکھتے ہوئے گزارا۔ امریکہ کے ساتھ ہم پاکستانیوں کا بھی عجب تعلق ہے...... ہر بات کا الزام امریکہ پر بھی اور امریکی ویزے کے لیے بیتابی بھی! اسی لیے ان کی ویزا دینے کی ساری کارروائی یک نکاتی ہوتی ہے...... یہ یقین حاصل کرنا کہ جانے والا واپس آئے گا یا نہیں۔ جہاں ذرا شک پڑا، صاف انکار کر دیا۔ اس کے باوجود انسانی حقوق، آزادی، ڈالروں اور کمرشل ازم کا یہ پائڈ پائپر ہر سال ہمارے کتنے ہی ذہین نوجوان اپنے پیچھے لگائے خوابوں کی اس سرزمین میں کھو جاتا ہے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں...... جانے والوں پر، اور یہاں رہ جانے والوں کی ''بے وقار آزادی'' پر!!

تو مجھ کو چاہتا ہے اس مغالطے میں رہوں
کبھی کرم بھی کیا کر کہ آسرے میں رہوں
وہ جو مقام ہے تیرا مری کہانی میں
اسی مقام پہ میں تیرے تذکرے میں رہوں

ایرپورٹ سے گھر تک لاہور کی کشادہ سڑکوں پر جھکا ہؤا تاروں بھرا آسمان خود بخود دور تک نظر آ رہا تھا۔ پیلی روشنیوں میں سڑکوں کے بیچ بچھی ہوئی سبز گھاس اور زیادہ تر و تازہ لگ رہی تھی، خالی سڑکوں پر اس وقت صرف روشنی میں بھیگے ہوئے پھولوں کے قطعے تھے۔ بے چاند کی اس رات کے آخری پہر جب میں گھر میں داخل ہوئی تو وہ تاریک گھنٹہ چل رہا تھا جو ہر گھنٹے کے بعد آتا ہے اور سالہا سال سے ہماری قسمت بن گیا ہے۔

آج پہلی بار یہ گھنٹہ برا نہیں لگا!

(ختم شد)

7:http://www.theory.org.uk/giddens2.htm

☆☆☆☆☆

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی

آسیہ راشد

نبی ﷺ کی ولادت اور بچپن

آپؐ کے دادا شاداں و فرحاں آپ کو اٹھا کر خانہ کعبہ میں چلے گئے۔ گود میں لیے لیے آپ کو کعبہ کا طواف کروایا پھر کعبہ کے اندر جا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کا شکر ادا کیا اور کہا آئندہ چل کر اس بچے کی شان بہت بلند ہوگی۔

ابن عبداللہ کی پیدائش کے ساتویں دن عرب کے رسم و رواج کے مطابق آپؐ کا عقیقہ کیا گیا۔ تمام خاندان کے لوگوں کو دعوت دی گئی۔ سبھی رشتہ داروں نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ جوان عبداللہ کی وفات سے سبھی کے دل افسردہ تھے، ان کے بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر سب آمنہؓ اور عبدالمطلب کو مبارکباد دینے آئے تھے۔ سبھی کے دل کھل اٹھے تھے۔ عبداللہ کے بڑے بھائی اور بہنیں بھی شریک ہوئیں۔ ان کے بھائی ابو لہب کو بچے کی پیدائش کی خوش خبری اس کی لونڈی ثوبیہ نے سنائی۔ وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس نے یہ خبر سنانے پر ثوبیہ کو آزاد کر دیا۔

تمام مہمانوں کی تواضع کیلئے جانور ذبح کیے گئے اور وہاں کا مشہور کھانا ''ثرید'' (یہ گوشت کا سالن تھا جس میں روٹی کے ٹکڑے ڈبو کر کھائے جاتے تھے) تیار کیا گیا اور تمام لوگوں کو کھلایا گیا۔

اس موقع پر آپؐ کے سر کے بال اتروائے گئے اور بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کی گئی۔ عبدالمطلب نے ان کا نام ''محمدؐ'' تجویز کیا جس کے معنی ہیں ''تعریف کیا گیا۔'' یہ نام ان لوگوں کیلئے بالکل نیا تھا مگر سبھی نے پسند کیا۔ اور آپؐ کی والدہ آمنہؓ نے ان کیلئے ''احمدؐ'' نام پسند کیا۔ جس کے معنی ہیں بہت زیادہ حمد یعنی تعریف کرنے والا۔ یوں حضرت عیسیٰؑ کی بشارت پوری ہوئی۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا میرے بعد ایک نبیؐ آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

اس موقع پر یقیناً آمنہؓ اللہ کا شکر ادا کرتی رہی ہوں گی اور ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنے شوہر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہوگی۔

محمدؐ کو پہلے تین روز آپؐ کی والدہ نے دودھ پلایا پھر آپؐ کی پہلی دایہ ہونے کا اعزاز ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی ثوبیہ کو حاصل ہوا۔ ثوبیہ نے آپؐ کو دودھ اس وقت تک پلایا جب تک حلیمہ سعدیہ آپ کو لے کر نہیں چلی گئیں۔ عرب کے رسم و رواج کے مطابق نومولود بچوں کو شہری امراض سے دور رکھنے کے لئے دودھ پلانے والی بدوی عورتوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے تاکہ ان کے جسم طاقتور اور اعصاب مضبوط ہوں اور اپنے ہی گہوارہ سے خالص اور ٹھوس عربی زبان سیکھ سکیں۔ اسی دستور کے مطابق عبدالمطلب نے دودھ پلانے والی دایہ کی تلاش کی اور آمنہؓ نے اپنے جگر گوشہ کو حلیمہ بنت ذویب کے حوالے کیا۔

یہ قبیلہ بن سعد بن بکر کی ایک خاتون تھیں، یہ قبیلہ اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے مشہور تھا۔ (نبی کریمؐ اپنی فصاحت زبان کے بارے میں فرماتے ہیں ''میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں کیونکہ میرا خاندان قریش ہے اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے۔'')

حلیمہ سعدیہ بیان کرتی ہیں۔ ''میں اپنی بستی سے اپنے شوہر اور ایک شیر خوار بچے عبداللہ کو لے کر بنی سعد بن بکر کی چند عورتوں کے ساتھ دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں نکلی۔ وہ قحط کا زمانہ تھا۔ ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک بھورے یا خاکی رنگ کی گدھی پر نکلی اور ہمارے ساتھ ایک بوڑھی اونٹنی بھی تھی جس سے خدا کی قسم ایک قطرہ دودھ بھی نہ مل سکتا تھا۔ ہمارا حال یہ تھا کہ ہمارے اس بچے کو جو ہمارے ساتھ تھا بھوک سے رونے کے سبب ساری رات نہ سو سکتے تھے۔ ہماری بوڑھی اونٹنی کے پاس کچھ نہ تھا جو اس کے کھانے کے کام آئے۔

یہاں تک کہ ہم مکہ پہنچ گئے۔ ہم میں سے کوئی عورت ایسی نہ تھی جس کے پاس ننھے محمدؐ کو پیش نہ کیا گیا ہو لیکن جب اس سے یہ کہا جاتا کہ آپؐ یتیم ہیں تو وہ آپؐ کو لینے سے انکار کر دیتی چونکہ ہم بچے کے باپ کی

طرف سے نیک سلوک کی امید رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ یتیم ہے اوراس کی ماں آمنہؓ اور دادا عبدالمطلب سے حسن سلوک کی کیا امید ہوسکتی ہے اسی لئے ہم نے اسے لینا پسند نہیں کیا ۔ میرے ساتھ آئی ہوئی عورتوں میں سے بجز میرے کوئی عورت باقی نہ رہی جس نے کوئی شیر خوار نہ لیا ہو۔ جب ہم واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے تو میں نے اپنے شوہر سے کہا، میں یہ بات ناپسند کرتی ہوں کہ کوئی شیر خوار لیے بغیر اپنی ساتھ والیوں میں لوٹوں ۔ میں تو اس یتیم کے پاس جاؤں گی اور اسے ضرور لے لوں گی ۔ انہوں نے کہا ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیا عجب ہے اللہ تعالیٰ اسی میں ہمیں برکت دے دے ۔ پس میں ان کے پاس گئی اور آپؐ کی والدہ آمنہؓ اور دادا سے درخواست کی کہ میں محمدؐ کو لے جانا چاہتی ہوں ۔ انہوں نے مجھے بخوشی محمدؐ کو سونپ دیا۔ میرے اس فعل کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مجھے آپؐ کے سوا کوئی اور نہ ملا۔

انہوں نے کہا میں پھر آپؐ کو لے کر اپنی سواری کی طرف لوٹی جب میں نے آپؐ کو گود میں اٹھایا تو آپؐ کو گود میں لے کر حسب خواہش دودھ پلایا آپؐ نے پیا اور سیر ہو گئے ۔ آپ کے ساتھ آپ کے بھائی یعنی میرے بیٹے نے بھی پیا اور وہ بھی سیر ہو گیا، پھر دونوں سو گئے ۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کے ساتھ ہم سوتے بھی نہ تھے میرا شوہر بوڑھی اونٹنی کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ دودھ سے بھری ہوئی ہے اس سے اتنا دودھ دوھا کہ میرے شوہر نے بھی پیا اور میں نے بھی ۔ صبح ہوئی تو میرے شوہر نے کہا، اے حلیمہ خدا کی قسم خوب سمجھ لو کہ تم نے ایک ذات مبارک کو پایا۔ میں نے جواب دیا خدا کی قسم مجھے یہی امید تھی۔

پھر ہم نکلے۔ میں اپنی گدھی پر سوار ہوگئی اور آپؐ کو بھی اپنے ساتھ سوار کرالیا۔ خدا کی قسم وہ گدھی قافلے سے آگے ہوگئی ۔ قافلے والوں کی گدھیوں میں سے کوئی اسکا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ یہاں تک کہ میرے ساتھ والیاں مجھ سے کہنے لگیں، اے ابوذویب کی بیٹی! تجھ پر افسوس ہے ہماری خاطر ذرا درمیانی چال چل ۔ کیا یہ تیری وہ گدھی نہیں جس پر تو گھر سے نکلی تھی میں ان سے کہتی کیوں نہیں یہ وہی تو ہے تو وہ کہتیں ''خدا کی قسم، اس کا یقیناً کوئی خاص معاملہ ہے۔''

پھر ہم اپنے گھر آئے ، جو بنو سعد کی بستیوں میں سے تھا اور اللہ تعالیٰ کی زمین میں میں کسی کو نہیں جانتی جو اس سے زیادہ قحط زدہ ہو۔ مگر جب ہم آپؐ کو اپنے ساتھ لائے تو میری بکریاں چراہ گاہ سے شام کو لوٹتیں اور خوب دودھ سے بھری ہوئی ہوتیں ۔ ہم دودھ دوھتے پیتے اور دوسرے لوگوں میں سے کوئی شخص اپنی بکریوں سے دودھ کا قطرہ تک نہ دوہتا نہ ہی تھنوں میں ایک قطرہ ہی پاتا ۔ ہماری قوم کے لوگ جو ہمارے قریب ہی رہا کرتے تھے اپنے چرواہوں سے کہتے اے کم بختو! ابوذویب کی بیٹی کا چرواہا جہاں بکریاں چرنے چھوڑتا ہے تم بھی وہیں چھوڑو، وہ ایسا ہی کرتے مگر پھر بھی ان کی بکریاں بھوکی واپس آتیں ۔ ایک قطرہ دودھ نہ دیتیں اور میری بکریاں دودھ سے بھری ہوئی اور سیر لوٹتیں ۔ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت ہی دیکھتے رہے یہاں تک کہ آپؐ کے دو سال گزر گئے میں نے دودھ چھڑوا دیا۔ دو سال پورے ہوتے وہ کڑے اور گٹھیلے ہو چلے تھے۔ اس کے بعد ہم آپؐ کو لے کر آپؐ کے خاندان میں ان کی والدہ آمنہؓ سے ملوانے کیلئے لے کر آگئے۔

بی بی آمنہؓ نے جب اپنے لال کو دیکھا تو انہیں پہچان نہ پائیں آپؐ اپنی عمر سے کافی بڑے معلوم ہوتے تھے گاؤں کی کھلی آب وہوا نے آپؐ کو صحت مند اور توانا بنا دیا تھا۔ آمنہؓ نے اپنے پیارے بیٹے احمدؐ کو خوب خوب پیار کیا ان کی معصوم باتوں سے ان کے دل کو یک گونہ اطمینان ملا انہوں نے چاہا کہ محمدؐ اب ان کے پاس ہی رہ جائیں مگر حلیمہ سعدیہ ان کی جو برکات دیکھ رہی تھیں ان کو دیکھتے ہوئے وہ پوری کوشش کر رہی تھیں کہ وہ محمدؐ کو واپس اپنے ساتھ لے جائیں چنانچہ انہوں نے والدہ محمدؐ سے گفتگو کی اور کہا کہ کیوں نہ آپ اپنے بچے کو میرے پاس ہی رہنے دیں کیونکہ مجھے اس کے متعلق وبا کا خطرہ ہے ۔ غرض حلیمہ سعدیہ کے مسلسل اصرار پر انہوں نے واپس انہیں بھیج دیا۔ (واقعہ فیل کے بعد مکہ میں چیچک، خسرہ، طاعون کی وبائیں پھیل چکی تھیں جن کا اس دور میں کوئی علاج نہ تھا)

اس طرح رسول اللہؐ مدت رضاعت ختم ہونے کے بعد بھی بنو سعد میں رہے یہاں تک کہ ولادت کے چوتھے پانچویں سال یعنی آپؐ کی

عمر چار یا پانچ برس کی ہوگی جب شق صدر(سینہ مبارک چاک کیے جانے) کا واقعہ پیش آیا۔اس کی تفصیل حضرت انسؓ سے مروی ہے رسولؐ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے جب حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے۔ انہوں نے آپؐ کو پکڑ کر لٹایا اور سینہ چاک کر کے دل نکالا پھر دل سے ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا یہ تم سے شیطان کا حصہ ہے، پھر دل کو ایک طشت میں زم زم کے پانی سے دھویا پھر اسے جوڑ کر اس کی جگہ لوٹا دیا (حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میں رسولؐ کے سینے پر سیے جانے کا نشان دیکھا کرتا تھا، ادھر بچے دوڑ کر آپؐ کی ماں یعنی حلیمہ سعدیہ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کچھ لوگ محمدؐ کو قتل کر رہے ہیں۔محمدؐ کو دو شخصوں نے جو سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں پکڑ لیا، لٹا کر ان کا پیٹ چاک کر ڈالا اور انہیں مار رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی حلیمہ شوہر اور گھر کے دیگر افراد دوڑے اور انہوں نے آپؐ کو اس حال میں کھڑا پایا کہ آپؐ کا رنگ اترا ہوا تھا۔آپؐ کے رضاعی والد نے آپؐ کو گلے لگایا پیار کیا اور پوچھا پیارے بیٹے کیا ہوا۔آپؐ نے سارا حال سنایا۔ یہ سن کر سب گھر والے ڈر گئے اور گھبرا گئے۔حلیمہ کے شوہر نے ان سے کہا ''اے حلیمہ مجھے خوف ہے کہ اس لڑکے پر کوئی اثر نہ ہو گیا ہو۔'' اس کے ظاہر ہونے سے پہلے اسے اس کے گھر پہنچا دو۔لہٰذا وہ انہیں ساتھ لے کر واپس آپؐ کی والدہ کے پاس لے آئے۔

آپؐ کی والدہ آمنہؓ ان سب کو اچانک دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور اپنے بیٹے کو سامنے پا کر خوش بھی ہوئیں اور بولیں حلیمہ تم اسے ابھی کیوں لائیں حالانکہ تم تو اسے اپنے پاس رکھنے کی بہت آرزومند تھیں انہوں نے کہا جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے اب اسے سن تمیز کو پہنچا دیا اور مجھ پر جو فرائض تھے وہ میں نے ادا کر دیئے۔ مجھے اس پر حوادث کا خوف ہوا۔ اس لیے میں نے انہیں آپ کی مرضی کے مطابق اسے آپ تک پہنچا دیا حضرت آمنہؓ نے جب ان کی بات سنی تو انہیں یقین نہیں آیا انہوں نے کہا مجھے کوئی اور ہی معاملہ لگ رہا ہے جب تک مجھے اصل بات سے آگاہ نہیں کرو گی میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گی تو حلیمہ سعدیہ کو تمام باتیں بتانی پڑیں۔انہوں نے کہا۔

''جب ہم محمدؐ کو آپ سے ملوانے کے بعد واپس لے کر چلے تو راستے میں حبشہ کے چند نصرانی ہمیں مل گئے۔انہوں نے آپؐ کو غور سے دیکھا خوب جانچا مجھ سے سوالات کیے پھر آپس میں باتیں کیں اور کہا آؤ اس لڑکے کو لے لیں اور اپنے بادشاہ کے پاس اپنے وطن لے جائیں کیونکہ یہ ایسا لڑکا ہے جس کی بڑی شان ہوگی ہم اس کے حالات خوب جانتے ہیں۔میں (حلیمہ) ان کی گفتگو سن کر پریشان ہوگئی اور مجھے ان سے پیچھا چھڑوانا مشکل ہو گیا مشکل تمام ان سے چھٹکارا حاصل کیا اور ہم اپنے گھر واپس لوٹے اس کے بعد ''شق صدر'' کا واقعہ پیش آ گیا۔

''راستے میں آتے ہوئے ایک پریشانی اور دیکھنی پڑی'' حلیمہ بولیں۔

''وہ کیا؟ آمنہؓ بنت وہب نے پوچھا۔

''جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ مجھ سے ہاتھ چھڑوا کر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گئے میں نے انہیں بہت تلاش کیا مگر آپؐ نہ ملے، پھر آپؐ کے دادا عبدالمطلب کو اطلاع دی کہ آج رات میں آپ کے پوتے کو لے کر یہاں آئی جب مکہ کے بلند حصے میں پہنچی تو وہ مجھ سے الگ ہو کر کھو گئے خدا کی قسم میں نے بہت تلاش کیا مگر وہ مجھے نہیں ملے۔ اب مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔عبدالمطلب نے جب یہ بات سنی تو فوراً کعبۃ اللہ کے پاس کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اسی اثناء میں ورقہ بن نوفل بن اسد اور کسی ایک اور شخص کو آپ مل گئے وہ دونوں آپ کو لے کر عبدالمطلب کے پاس آئے اور کہا آپ کا یہ بچہ ہمیں مکہ کے بلند حصے میں ملا ہے۔عبدالمطلب نے آپؐ کو گردن پر بٹھا لیا اسی طرح وہ کعبۃ اللہ کا طواف کرتے جاتے اور آپؐ کیلئے دعا کرتے جاتے اور پناہ مانگتے جاتے پھر انہوں نے آپؐ کو ہمارے پاس بھجوا دیا۔اب آپ کی امانت آپ کے سپرد کرتی ہوں آپ مجھے اجازت دیں۔''

آپؐ کی پرورش اور نگہداشت کے معاوضے کے طور پر اس وقت کے رسم و رواج کے مطابق روپے پیسے، اناج، کھجوریں وغیرہ دے کر رخصت کیا گیا۔

اب آپ اپنی والدہ حضرت آمنہؓ کے دامن شفقت میں آ گئے تھے آپؐ نے دو سال اپنی والدہ کے سایہ شفقت میں گزارے۔آپؐ کی

والدہ کی لونڈی ام ایمن آپؐ کی نگہداشت اور پرورش پر مامور کردی گئی تھیں ۔انہوں نے نہایت محبت و پیار سے آپؐ کی دیکھ بھال کی ۔شوہر کی وفات اور بیٹے کی جدائی نے حضرت آمنہؓ کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا آپؓ اکثر بیمار رہنے لگی تھیں کبھی کبھار بخار ہوجاتا کمزوری بڑھ جاتی آپؓ کو ان دنوں اپنے شوہر کی یاد بے طرح آنے لگی تھی وہ یثرب جانا چاہتی تھیں ۔

وہ اپنے بیٹے محمدؐ کو اپنے شوہر اور ان کے باپ کی قبر کی زیارت کروانا چاہتی تھیں تا کہ محمدؐ کے دل میں والد کے بارے کچھ تو نقش بنیں ۔جو پیدائشی یتیم تھے،جنہوں نے اپنے والد کی شبیہہ بھی نہ دیکھی تھی کم از کم ان کی قبر کی زیارت ہی کر لیتے ۔وہ خود بھی اپنے محبوب شوہر کی آخری آرامگاہ دیکھنا چاہتی تھیں ۔انہوں نے اپنے سسر عبدالمطلب سے یثرب جانے کی اجازت مانگی ۔عبدالمطلب ان کی اداسی خوب اچھی طرح جانتے تھے انہوں نے بخوشی جانے کی اجازت دے دی مگر راستہ بہت طویل تھا ان دنوں سفری سہولیات بھی نہیں تھیں ۔یثرب (مدینہ) مکہ سے پانچ سو کلو میٹر کی مسافت پر تھا ۔اس لئے عبدالمطلب نے انہیں اکیلے بھیجنے کی بجائے ساتھ جانا مناسب سمجھا اور اس طرح آپؓ اپنے بیٹے محمدؐ،لونڈی ام ایمنؓ اور عبدالمطلب کی معیت میں مدینہ تشریف لے گئیں ۔

وہاں وہ بنونجار کے ہاں ٹھہرے جو عبدالمطلب کا ننھیالی گھرانہ تھا ۔ان لوگوں نے آپ سب کی بہت آؤ بھگت کی ۔وہاں انہوں نے آپؐ کا تعارف اپنے بھائیوں سے کروایا ۔پھر یثرب میں انہوں نے حضرت عبداللہ کی قبر کی زیارت کی ۔عبدالمطلب کے ساتھ سیدہ آمنہؓ، ننھے حضورؐ اور ام ایمن بھی تھیں سیدہ آمنہؓ اپنے شوہر کی وفات کے بعد پہلی بار وہاں آئی تھیں ۔

مکہ کی نسبت مدینہ ایک سرسبز خطہ تھا وہاں باغات تھے ہری بھری کھیتیاں تھیں صحراؤں اور مکہ کی وادی کے برعکس جس میں کوئی زراعت نہیں ہوتی تھی ۔وہاں پانی کے تالاب تھے جن میں چھوٹے چھوٹے بچے نہاتے اور تیر کر چھوٹے پانی سے گہرے پانی میں جایا کرتے تھے ۔بنی نجار کے بچے اپنے مہمان کو بھی ساتھ لے جاتے تھے حضورؐ بھی ان کے ساتھ مل کر تالاب میں نہایا کرتے اور تیرنے کی کوشش کرتے ۔تالاب کے پاس درختوں پر پرندے آتے تو بچے انہیں اڑانے لگتے حضورؐ بھی اس کھیل میں ان کے ساتھ شامل ہوجاتے ۔

مکہ سے ہجرت کر کے جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ کے ذہن میں اس قیام کے سب واقعات اور مقامات تازہ تھے ۔آپؐ صحابہ کرامؓ کو اپنے بچپن کے واقعات سنایا کرتے اور بتایا کرتے کہ جن بچوں کے ساتھ مل کر آپؐ کھیلا کرتے تھے ان میں ایک لڑکی کا نام انیسہ تھا ۔

حضرت آمنہؓ نے مدینے میں ایک ماہ تک قیام کیا پھر وہ اپنے سسر عبدالمطلبؓ بیٹے اور ام ایمنؓ کے ہمراہ واپس مکہ کے لئے روانہ ہوئیں،اسی راستے پر جس پر زمانہ قدیم سے مکہ اور مدینہ کے درمیان قافلے سفر کرتے تھے ۔جناب عبدالمطلبؓ اسی راستے سے پہلے بھی کئی بار گزرے ہوں گے ۔راستے میں آنے والی آبادیوں اور خیمہ بستیوں کے سرداران کو جانتے تھے ۔منزل منزل چلتا ہوا ان کا قافلہ جب ابواء کی وادی میں پہنچا تو سیدہ آمنہؓ کی طبیعت ناساز ہوگئی ۔جناب عبد المطلبؓ وہیں ٹھہر گئے اور ان کے صحت یاب ہونے کا انتظار کرنے لگے ۔لیکن ان کی زندگی کا سفر مکمل ہو چکا تھا باپ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی والدہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا ۔یوں آمنہؓ دوران سفر وفات پا گئیں ۔

ابواء کے باسیوں نے پہاڑی کے دامن میں سیدہ آمنہؓ کیلئے قبر کھودی اور سیدہ آمنہ کو قبر کے سپرد کردیا ۔حضورؐ مدینہ میں اپنے والد کی قبر دیکھ کر آرہے تھے اور اب ابواء میں اپنی والدہ محترمہ کو قبر میں اترتے دیکھ لیا ۔اس وقت آپؐ کے دکھ کا اندازہ کون لگا سکتا ہے ۔جب لوگ قبر پر مٹی ڈال کر واپس ہوئے تو حضورؐ قبر کے پاس افسردہ بیٹھے تھے اور سیدہ آمنہؓ اپنے رب کے پاس پہنچ چکی تھیں،جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا ۔

حضرت آمنہؓ کی وفات کے بعد آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے سنبھال لی تھی ۔

استفادہ: سیرت ابن ہشام،الامین محمد رفیق ڈوگر،رحیق المختوم از مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری،سیرت النبی از علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی ۔ننھے حضورؐ احسان بی اے

☆......☆......☆

ربیعہ ندرت

مجھے گھر جانا ہے

مجھے پھر کینیڈا کا سفر درپیش ہے۔ پھر وہی پرانی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ منیب بضد ہے کہ میں کچھ عرصہ کے لئے اس کے پاس رہوں۔ میں اسے اپنی ان گنت مصروفیات گن گن کر بتا رہی ہوں کہ فی الحال میرا پاکستان میں رہنا بے حد ضروری ہے۔

؎ میرے سامنے کارواں اور بھی ہیں

مجھ سے مایوس ہو کر اس نے اپنے والد سے رابطہ کر لیا ہے۔ حسب سابق انہوں نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اسے یقین دلایا ہے کہ

''ماں سے کچھ نہ کہو۔ اس کو وہاں بھیجنا میرا کام ہے۔ اب تم نے اس کام کے لئے موزوں آدمی سے رابطہ کر لیا ہے تو پھر فکر کا ہے کی۔''

اس کے بعد انہوں نے جارحانہ انداز اپناتے ہوئے مجھے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''بیگم تیاری کر لو۔ تم عنقریب کینیڈا جا رہی ہو۔''

میں نے جز بز ہوتے ہوئے عرض کیا کہ فی الحال میرے لئے یہ مشکل ہے لیکن انہوں نے سنی ان سنی کر دی اور میں جان گئی کہ اب میرے پاس تقدیر سے راضی ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

؎ دل کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا

دوسرے دن منیب کا فون آ گیا۔ اس کی آواز میں خوشی اور شوخی کی آمیزش تھی کہنے لگا۔

''ماں جی! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ مورخہ 21 جولائی کو دوپہر ایک بجے ٹورنٹو ائیر پورٹ پر پہنچ رہی ہیں۔''

مارے حیرت کے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بے اختیار میں نے کہا۔

''اتنی جلدی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے تیاری کیلئے کچھ وقت درکار ہے۔'' وہ کہنے لگا۔

''تیاری کیسی؟ آپ کا کام تو صرف یہ ہے کہ چند جوڑے کپڑوں کے اپنے بیگ میں رکھ لیں اور مقررہ تاریخ پر صبح ساڑھے چار بجے ائیر پورٹ پر پہنچ جائیں۔ اتنے سے کام کے لئے بھلا کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ ہمارے لئے کچھ نہ لائیے گا۔ ضرورت کی سب چیزیں یہاں سے مل جاتی ہیں۔''

چنانچہ 21 جولائی کو میں چاروناچار علی الصبح مقررہ وقت پر اپنے میاں کے ساتھ لاہور ائیر پورٹ پہنچ گئی۔ اپنا سامان سمیٹ کر میاں کو خدا حافظ کہا اور عمارت کے اندر داخل ہو گئی۔ بورڈنگ کارڈ کے حصول کے لئے لوگ قطاروں میں کھڑے تھے۔ میں بھی ایک قطار کے آخر میں کھڑی ہو گئی۔ میرے آگے ایک بارلیش نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی باری آنے پر جب اس کا سامان تولا گیا تو وہ مقررہ وزن سے زیادہ تھا۔ کاؤنٹر کے ساتھ بیٹھے ہوئے عملے کے آدمی نے مہذب لہجے میں اس سے کہا کہ آپ کا سامان زیادہ ہے۔ اگر آپ تھوڑا بہت غیر ضروری سامان نکال کر اپنے اس ساتھی یا رشتہ دار کو دے دیں، جو آپ کو ائیر پورٹ چھوڑنے آیا ہوگا اور عمارت کے باہر موجود ہوگا، تو یہ بہتر ہوگا۔ اس نوجوان نے جواب دیا۔

''میرے بکسوں کو تالے لگے ہوئے ہیں اور میرے پاس ان کی چابیاں نہیں ہیں۔ لہٰذا میں سامان نہیں نکال سکتا۔''

عملے کے آدمی نے کہا ''پھر آپ فی کلو کے حساب سے زائد سامان کے مقررہ پیسے ادا کر دیں۔''

وہ کہنے لگا ''میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔'' عملے کا آدمی کہنے لگا۔ آپ

ٹورنٹو جا رہے ہیں۔ یقیناً آپ کے پاس کینیڈا کی کرنسی ہوگی۔ وہ سامنے منی ایکسچینج کی دکان ہے۔ وہاں سے آپ اس کے عوض پاکستانی کرنسی حاصل کر کے مقررہ رقم کی ادائیگی کر دیں۔''

اب وہ باریش نوجوان منت سماجت پر اتر آیا۔ دنیا بھر کی لجاجت اس کے لہجے میں سما گئی رقم کی اپیلیں کرنے لگا۔ عذر تراشنے لگا۔ بہانے اور تاویلات پیش کرنے لگا۔ عملے کے آدمی کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے پیسے لئے بغیر اس کا سامان بک کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی نوجوان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ قطار سے نکل کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر میرے دل میں خوشی کا جو ایک شعلہ سا لپکا تھا، وہ اس کی گفتگو سن کر قدرے بجھ گیا۔

اس کے بعد میری باری آ گئی۔ میرا سامان تول کر بک کر دیا گیا اور مجھے بورڈنگ کارڈ دے دیا گیا۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور چل دی۔ ذرا آگے بڑھی تو وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ نما کیبن خواتین کی تلاشی کیلئے بنا ہوا تھا۔ جونہی میں اس کیبن میں داخل ہوئی تو اس میں ڈیوٹی پر موجود خاتون نے مجھ سے پوچھا۔

''مادام! آپ کے پرس میں کیا ہے؟''

میں نے کہا۔

''اس میں میرا پاسپورٹ ہے، میری ٹکٹ ہے اور چند سو ڈالر ہیں۔''

اس نے میرا پرس دیکھا اور پوچھنے لگی۔

''آپ صرف اتنے ڈالر لے کر جا رہی ہیں؟''

میں نے کہا۔

'بیٹی! میرے لئے تو پچاس یا سو ڈالر بھی بہت تھے۔ اس سے زائد تو میاں کے اصرار کی وجہ سے رکھنا پڑے۔''

میرا جواب سن کر وہ خاتون مسکرا دی اور اس نے مجھے سفر کی آسانی اور عافیت کی ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ میرا دل خوش ہو گیا کہ سفر کا آغاز کیسی اچھی دعاؤں سے ہوا تھا۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور لاؤنج میں جا کر ایک صوفے پر بیٹھ کر دوسرے مسافروں کے ساتھ انتظار کرنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد پرواز کی روانگی کا اعلان ہو گیا اور ہم سب قطار بنا کر جہاز میں یکے بعد دیگرے داخل ہونے لگے۔ جہاز میں داخل ہونے کے بعد میری نظر ناگاہ دائیں طرف پڑی۔ وہی باریش نوجوان کان سے موبائل فون لگائے کسی سے کہہ رہا تھا

''الحمدللہ۔ اللہ کا شکر ہے کہ پیسے دیئے بغیر ہی اپنا کام بن گیا۔''

میری سیٹ جہاز کے آخر میں تھی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے دل ہی دل میں سفر کی آسانی اور خیر و برکت کیلئے دعا کی۔ مقررہ وقت پر جہاز نے زمین پر رینگنا شروع کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور وہ فضا میں بلند ہو گیا۔

طرفہ تماشہ ہے کہ میں گھر میں تھی تو ذہن ہوائی جہاز کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ پرواز کو کتنے دن رہ گئے؟ کون کون سی چیزیں ساتھ لے کر جانا ہے؟ کون سی غیر اہم چیزیں چھوڑ کر جانا ہے؟ تیاری کس مرحلے میں ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب گھر سے نکلی تو میرا گھر بھی میرے ساتھ چل دیا۔

ارے مجھے چھوڑ کر کہاں چل دی۔ لو میں بھی چل رہا ہوں تمہارے ساتھ؟

اب جہاز میں بیٹھی ہوں اور میرا گھر میرے ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔ خدا جانے میری مددگار رشیدہ بی بی اب تک آ گئی ہوگی یا نہیں؟ او ہو فلاں الماری کو تالا لگانا بھول گئی۔ اونی کپڑوں کے بکس میں فینائل کی گولیاں رکھنا بھول گئی۔ اخبار کا بل دینا بھول گئی۔ فریزر کو صاف نہیں کر سکی۔

دل چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ روکو بھئی جہاز کو روکو۔ ایمرجنسی لینڈنگ کا اعلان کر دو۔ کیونکہ مجھے گھر جانا ہے۔ میں جلدی جلدی گھر کے چند اہم امور نبٹا کر واپس آ رہی ہوں۔ روکو بھئی روکو۔

لیکن میرے دل کی آواز پر کوئی کان نہیں دھر رہا۔ سب اپنے اپنے دل کی سن رہے ہیں اور مگن ہیں۔ جہاز اڑ رہا ہے۔ میرا جسم جہاز کی ایک نشست پر جلوہ آرا ہے لیکن میرا ذہن جہاز سے دور میرے گھر کے

درودیوار میں مقید ہے۔ حالانکہ ان دونوں چیزوں کو ایک وقت میں اکٹھے ایک جگہ پر ہونا چاہیے لیکن دنوں کو یکجا کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ میرے بچپن میں امی نے ہزار دفعہ مجھے سمجھایا کہ تم خود اپنی چیزوں کی ذمہ دار ہو۔ اپنی چیزیں سنبھال کر ان کی جگہ پر رکھا کرو۔ لیکن امی نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اگر چیزوں کو پیر لگ جائیں تو پھر کوئی کیا کرے۔ اگر چیزوں کو پر لگ جائیں تو پھر کوئی کیا کرے۔ اگر چیزیں خود مختار ہو جائیں تو پھر کوئی کیا کرے۔ ویسے بھی یہ جمہوری دور ہے۔ ہر چیز آنکھیں دکھاتی ہے۔ ہماری رائے کا احترام کرو۔ ہمیں ہماری مرضی سے چلنے دو۔

میرا دل شدت سے چار ہا ہے کہ میں گھر لوٹ جاؤں مجھے گھر جانا ہے۔ ادھورے کاموں کی تکمیل کے بعد میں تسلی سے پھر جہاز میں آ کر بیٹھ جاؤں گی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ آج سے بہت پہلے میری پیدائش کے وقت ...... جب مجھے میرے گھر سے یہ کہہ کر رخصت کیا گیا تھا کہ اب تمہاری زندگی کے سفر کا آغاز کیا جاتا ہے ۔...... تمہیں تمہاری ضرورت کا سب سامان دے کر کچھ عرصہ کیلئے ایک عارضی ٹھکانے کی طرف روانہ کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھکانہ تمہاری امتحان گاہ ہے۔ سنو! غور سے سنو کہ وہاں اپنی زندگی کو اپنے خالق کے احکام کے مطابق اپنی ضرورتوں کے تحت بسر کرنا اپنی خواہشوں کی غلامی اختیار نہ کر لینا۔ کیونکہ جو شخص ایسا کرے گا وہ اس خوفزدہ اور کمزور گھڑسوار کی مانند زندہ رہے گا جو اپنی منزل سے بے خبر ہر آن لرزاں وترساں زندگی کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتا ہے۔ اب یہ گھوڑے کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ جہاں چاہے، اسے لے جائے۔ اس کی منزل سے دور ...... اس کے گھر سے دور ...... دور سے دور تر ...... لیکن جو شخص بے کار خواہشوں سے دامن بچا کر اپنی زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھ لے گا وہ اس مضبوط اور ماہر شہ سوار کی مانند ہو گا جو زندگی کے گھوڑے کی رفتار، رخ، راستے اور منزل کا تعین خود کرے گا۔ اس کی رہنمائی نشانِ منزل سے کی جائے گی اور بالآخر وہ شاد کام و بامراد ہو کر بصد عزت وافتخار اپنے گھر لوٹے گا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی سفر کی اور وہ بھی میری زندگی کے پہلے سفر کی۔ جب مجھے میرے ابدی گھر سے رخصت کیا گیا تھا تو مجھے سمجھایا گیا تھا کہ خبردار، ہوشیار، دیکھ دنیا کے حسن ورنگینی کے دام میں اپنے آپ کو الجھا کر اپنی منزل کو کھوٹا نہ کرنا۔ وہاں عقلِ سلیم کو بروئے کار لانا اور اپنے دماغ کو مصروف کار رکھنا۔ لیکن میرا دماغ سویا رہتا ہے اور دل کوئے ملامت کے طواف کرنے میں مگن رہتا ہے۔ پھر میں بھول جاتی ہوں کہ میرا بھی کوئی گھر ہے۔ جہاں سے مجھے رخصت کیا گیا تھا اور جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

اس ہوائی سفر سے پہلے بھی مجھے چند طویل ہوائی سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ دورانِ پرواز مختلف ہوائی اڈوں پر مختصر قیام بھی کرنا پڑا۔ لیکن ہوائی اڈوں کی روشن، پررونق، پرآسائش، متحرک اور خوبصورت جگہوں کو دیکھ کر کبھی میرا دل یہ نہیں چاہا کہ میں اگلے سفر کو ترک کر کے، اپنی منزل سے منہ موڑ کر یہیں ڈیرے ڈال دوں۔ بلکہ اس دوران میں معمول سے بڑھ کر چوکس رہتی ہوں۔ میری نگاہ ہوائی اڈے کی تمام تر رونق اور خوبصورتی کو سطحی نظر سے دیکھ کر گھڑی پر آ کر رک جاتی ہے۔ میرے دماغ میں بار بار ایک ہی سوال اٹھتا ہے کہ میری اگلی پرواز کے روانہ ہونے میں کتنا وقت باقی ہے۔ پھر میرا ذہن مجھے تنبیہ کرتا خبردار، ہوشیار رہنا۔ دھیان ادھر ہی لگائے رکھنا۔ دیکھو کہیں تمہاری فلائٹ نہ چھوٹ جائے۔ تمہیں گھر جانا ہے۔ اس وقت میرے لئے ہوائی اڈے کے دلکش منظر چنداں اہمیت کے حامل نہیں ہوتے کیونکہ اگر میں ان میں کھو کر رہ جاؤں تو اپنی فلائٹ سے رہ جاؤں گی۔ نہیں نہیں مجھے گھر جانا ہے۔

پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ میرا دل اس دنیا کے حسن ورنگینی میں کھو کر رہ گیا ہے۔ میں بھول چکی ہوں کہ میرا بھی کوئی گھر ہے، جہاں سے مجھے رخصت کیا گیا تھا اور جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

☆......☆......☆

بشریٰ تسنیم

ہم دعا لکھتے رہے اور وہ دغا پڑھتے رہے

شام کو جب سرتاج گھر تشریف لائے تو خلاف معمول مکھڑے پہ مسکراہٹ غائب پائی گئی۔

اور اس کی وجہ تو وہ خود ہی تھے۔ اب کوئی پوچھے ان سے کہ خلاف معمول دوپہر کو گھر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی، جب کہ بیوی بھی منصورہ اجتماع میں گئی ہوئی ہو اور تسلی سے بیٹھی ہو کہ ابھی کون سا میاں کے آنے کا وقت ہے۔

''خفگی کا حق تو اصل میں ہمارا بنتا ہے''

اس فکر غالب کے ساتھ (اس سے مراد چچا غالب کی فکر ہرگز نہیں ہے)

ہم نے حسب عادت مگر بغیر جذبات کے ان کی استقبالیہ ضروریات کا خیال رکھا، اور ان کے چاند سے مکھڑے کو صرف ایک چہرہ سمجھ کر چشم پوشی سے کام لیتے رہے۔ ہمیں خفگی کا حق صرف اس لئے نہیں تھا کہ وہ گھر میں ہماری غیر موجودگی میں کیوں آئے۔ وجہ وہ رپورٹ تھی جو ہمیں بچوں سے ملی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ہم نے بدستور نظریں ملانے سے گریز کرتے ہوئے کہا

''ذرا تھوڑی دیر کے لئے باہر چلتے ہیں''

''کیوں؟''

''بات کرنی ہے؟''

''کیا بات کرنی ہے؟''

''جب کروں گی تو پتہ چل جائیگا''

ہم نے اپنی گریز والی پالیسی جاری رکھی اور ان کے چہرے اور اپنے چاند سے مکھڑے (کہنے میں کیا حرج ہے) کو روبرو نہ ہونے دیا۔

ان کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی سنجیدہ بات ہے اور اس پہ زوردار مکالمہ متوقع ہے۔ اس انداز میں باہر چلنے کی فرمائش اسی لئے ہوا کرتی ہے تا کہ گھر ماحولیاتی آلودگی سے پاک رہے۔

اپنی مردانہ برتری ثابت کرنے کے لئے استراحت فرمانے لگے کہ فوراً بیوی کا کہنا مان کر شانِ مردانگی پہ حرف نہ آجائے۔

ہم نے بھی مزید چشم پوشی کی اور باورچی خانے میں جا کر دھلے برتن دوبارہ دھونا شروع کر دئے۔

''اب چلتی ہو کہ نہیں''؟

گویا کہ ان کا کوئی کام ہے اور میں نہیں کرنا چاہتی۔

بچوں کو ان کے کمرے میں ٹکے رہنے کی ہدایت کر کے چپ چاپ چادر اُٹھائی اور پھر اتفاق ٹاؤن کی ویران سڑکوں پہ دو ناراض ''آدم وحوا'' چہل قدمی کرتے پائے گئے۔ بارھویں کا چاند بھی دونوں کو اداسی سے تک رہا تھا۔ سڑکوں پہ کسی قسم کی روشنی نہ تھی۔ سارا ماحول ناراض ناراض سا تھا۔ اس نیم اندھیرے اور چاند کی مدھم روشنی کا یہ فائدہ تھا کہ گریز والی پالیسی پہ عمل درآمد آسان تھا۔

''کیا ارشاد فرمانا ہے محترمہ نے؟''

''آپ دوپہر کو گھر تشریف لائے تھے؟''

''کوئی اعتراض ہے آپ کو میرے گھر آنے پہ؟ اور ملکہ عالیہ خود جو گھر میں تشریف فرما نہیں تھیں وہ؟''

''اچھا! تو آپ نے میرے تشریف فرما نہ ہونے پہ جو ارشاد فرمایا تھا وہ؟''

میں نے مارے ناراضگی کے خیالی پتھر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

''میں نے کیا ایسا کہہ دیا تھا جو اس قدر برہم ہو رہی ہو''

''آپ نے کہا تھا، آپ کو پتہ ہونا چاہئے''

حسب مزاج مجھے جھگڑا بڑھنے کا خوف لاحق ہونے لگا۔

بات کہاں سے شروع کروں کچھ سوچ کر میں نے پوچھا

''آپ نے بچوں سے کیا کہا تھا میرے بارے میں؟''

''سیدھی طرح بات بتاؤ کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟''

ہمیشہ کی طرح مجھے لگا کہ اب بھی وہی ہوگا یعنی:

''وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا''

میاں کے بگڑے تیور دیکھ کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ خود کو سرزنش بھی کی کہ یہ وقت ڈرنے کا نہیں ہے، مگر:

''کیا کرے کوئی جب جیا کرے دھک''

شاید پھر یہی ہوتا ہے کہ:

''انکھیوں میں انکھیاں ڈال کے نہ تک''

اس وقت دوسرے والا کام تو پہلے ہی ہو رہا تھا مگر پہلے پہ اختیار ممکن نہیں تھا سو جیا اپنی دھکڑ پکڑ سے باز نہ آیا۔

دل ناداں کی اسی بھاگم دوڑی میں ہم نے جلدی سے اپنی شکایت کا کنکر متوقع طوفان کے بھنور میں پھینکا۔

''آپ نے مجھے دجال کہا تھا بچوں کے سامنے''

''کیا؟؟؟؟؟'' ''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''بچوں نے''

''کون سے بچوں نے''

''جو ہیں اور کون سے؟''

''کیسے بتایا بچوں نے؟''

''بول کر ہی بتایا ہوگا ظاہر ہے پڑھ کر تو نہیں سنایا ہوگا''

''کیا بولا تھا بچوں نے''؟

''جو آپ نے اظہار فرمایا تھا''

''آدم و حوا'' دونوں چلتے چلتے رک گئے۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو'' آدمیت نے سرزنش بھرے لہجے میں للکارا۔

اتنا رعب ڈالنے کی کیا ضرورت ہے بھلا! یہ بات آرام سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ اندر سے سرگوشی منمنائی جس کی آواز صرف مجھے ہی سنائی دے سکتی تھی۔

''چلو بچوں سے پوچھو میرے سامنے''

''سچ سچ آپ بتائیں آپ نے کیا کہا تھا؟ کیا میں آپ کو دجال لگتی ہوں؟''

''نہیں، دجال کے بارے میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ وہ مؤنث ہوگا''

پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

''تمہیں معلوم ہے میں کیوں آیا تھا گھر؟''

''معلوم نہیں''

ہنوز انکھیوں میں انکھیاں ڈال کے نہ تکنے والی پالیسی جاری تھی۔

''میں نہیں بتاتا''

''پہلے یہ بتائیں آپ نے کیا کہا تھا''

''جب میں گھر آیا یہ سوچ کر کہ تمہیں سرپرائز دوں گا......''

''کس بات کا؟'' ابھی دجال والے فتنے کی مکمل وضاحت نہیں ہوئی تھی۔

''اب میں نے نہیں بتانا''

''اچھا؛ نہ بتائیں، یہ تو بتائیں آپ نے بچوں سے کیا کہا تھا؟''

ان جانے میں بالکل غیر ارادی طور پہ میں نے میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ میں ہاتھ آتے ہی ان کا لہجہ بدل گیا۔

''جب گھر آنے پہ تم مجھے نظر نہیں آتی تو مجھے لگتا ہے تم ایک ظالم جلاد ہو...... یہ میں نے بچوں سے کہا تھا کہ تمہاری ماں جلاد سے کم نہیں ہے''

تو گویا یہ حرفوں کے الٹ پھیر کا کمال ہے۔ سارے حرف تو وہی ہیں اور اس جلاد ہونے کی معرفت نے دل کی سرتال ہی بدل دی اور ایک ہتھیلی سے دوسری ہتھیلی کی حرارت نے دل کی ساری برف لمحوں میں پگھلا دی۔

''وہ کیا سرپرائز تھا''

''پہلے بتا دیا تو کیا سرپرائز رہے گا''

''اب تو بات نکل ہی گئی ہے بتانے میں کیا حرج ہے؟''

''میں نے تمہارے لئے مرسیڈیز خریدی ہے''

چاند کی طرف اشارہ کر کے میں نے میاں کا مکھڑا دیکھا تو ان کے ساتھ چاند بھی مسکرانے لگا۔ ویران سڑکیں دھیمی چاندنی میں رومانٹک لگنے لگیں۔☆

فریدہ خالد۔شیفیلڈ

سرونٹ لیڈر شپ

ایک جدید تصور جس سے آج مغربی دنیا بھر پور استفادہ کر رہی ہے مگر جس کی بنیاد ڈالنے والے نبیؐ اکرم تھے

سرونٹ اور لیڈر، یا یہ کہیں کہ نوکر اور قائد بلکہ قائد نوکر۔ ہے نا عجیب بات!!

جی ہاں ایسا ہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اسی موضوع پر ایک پریزینٹیشن کی تھی۔ میں یہ سن کر حیران رہ گئی کہ میری ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اس کے بارے میں سنا نہ تھا۔ اگر آپ نے اس بارے میں نہیں سنا تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہمارا آج کا موضوع یہی ہے۔

سرونٹ لیڈر شپ، لیڈر شپ ماڈل کی ایک قسم ہے جس کو سب سے پہلے گرین لیف نامی ایک امریکی نے 1977 میں متعارف کروایا۔ انہیں یہ آئیڈیا کیسے آیا اسکے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ 1965 میں انہوں نے ہسی ہرمین نامی ایک ناول نگار کا ناول، آ جرنی ٹو ایسٹ (مشرق کی طرف ایک سفر) پڑھا جس میں لیو نامی ایک نوکر تھا جو اس گروپ کے ساتھ تھا۔ وہ نوکر اس گروپ کے سارے کام کرتا تھا اور فرصت کے وقت انہیں مختلف گانے سنا کر یا مزیدار باتیں کر کے ان کا دل بہلاتا تھا۔ وہ پورا گروپ اس نوکر سے بہت خوش تھا۔ پھر اچانک نوکر لیو غائب ہو گیا۔ گروپ اس کے بغیر اس قدر مشکل میں رہا کہ اپنا سفر ہی جاری نہ رکھ سکا۔ کچھ عرصے بعد اس گروپ کے ایک شخص کو سرونٹ لیو کہیں ملا تو اسے معلوم ہوا کہ دراصل لیو اس پورے ادارے کا ہیڈ تھا جس نے اس گروپ کو سفر پر روانہ کیا تھا۔ گرین لیف کہتے ہیں کہ سرونٹ لیو دراصل کبھی بھی نوکر نہ تھا بلکہ وہ شروع سے ہی ایک لیڈر تھا۔

لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا کہ ہسی ہرمین کے اس ناول کو بہت سے لوگوں نے پڑھا تھا مگر عام لوگوں کو یہ ناول بہت کنفیوزنگ لگا اور کسی کو سمجھ ہی نہیں آیا تھا۔ جبکہ گرین لیف نے اس ناول سے ایک اتنی اہم بات سیکھی کہ اس پر ایک پورا ماڈل بنا ڈالا۔ بلکہ اس ماڈل پر ایک پورا ادارہ بنا گئے ہیں اور دنیا بھر میں اس ماڈل کو خوب استعمال بھی کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے، کہ سرونٹ لیڈر شپ ایک فلاسفی ہے اور سیٹ آف پریکٹسز ہے جو لوگوں کی زندگیوں کو بھر پور اور اداروں کو مضبوط بناتی ہے۔ اس طرح ایک انصاف پسند اور ہمدرد معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ گرین لیف کہتے ہیں کہ سرونٹ لیڈر شپ تمام مذاہب میں پریکٹس ہوتا ہے کیونکہ تمام پیغمبر دراصل سرونٹ لیڈرز تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیمؑ، داودؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ سب ہی اپنے زمانے کے لیڈرز تھے۔ اور عیسیٰؑ تو پرفیکٹ سرونٹ لیڈر تھے۔ رفیق بیکون ایک مسلمان رسرچر ہیں جو کہ امریکہ کی یونیورسٹی آف نیواڈا میں پڑھاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نبی سرونٹ لیڈر شپ کی ایک پرفیکٹ مثال ہیں۔

اب ہم بات کرتے ہیں کہ سرونٹ لیڈر شپ کیا ہوتی ہے۔ گرین لیف اپنے سب سے پہلے مضمون، ''سرونٹ بطور لیڈر''، جو انہوں نے 1970 میں لکھا تھا، کہتے ہیں کہ ایک سرونٹ لیڈر وہ ہوتا ہے جو اس بات پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی خدمت کرے۔ یہ لیڈر شپ اس احساس کے ساتھ شروع ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کی خدمت کرنا چاہتا ہے، اور پھر ایک قدرتی احساس کہ وہ اس خدمت کے ساتھ دوسروں کو لیڈ کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کی اہم ضروریات پوری کی جائیں۔

گرین لیف کہتے ہیں کہ اس لیڈر شپ کو چیک کرنے کے لئے بہترین ٹیسٹ یہ ہے کہ ایک سرونٹ لیڈر خود سے یہ سوالات پوچھے اور یہ کہ ان کے جوابات ہاں میں ہوں۔ سوالات یہ ہیں:

کیا وہ تمام لوگ جنہیں سرو کیا گیا وہ اس سروس کے نتیجے میں پہلے

سے زیادہ صحت مند،عقلمند، آزاد، زیادہ خودمختار اور وہ خود سرونٹ لیڈر بنے کہ نہیں؟

اور معاشرے کے محروم لوگوں پر اس لیڈرشپ کا کیا اثر پڑا ہے؟ کیا انہیں بھی فائدہ پہنچا؟ یا یہ کہ وہ مزید محروم تو نہیں ہوئے؟

گرین لیف اپنے دوسرے مضمون، ''ادارہ بطور سرونٹ'' میں، مزید کہتے ہیں کہ ان کا ایمان ہے کہ وہ ادارے جو اس قسم کی لیڈرشپ پریکٹس کرتے ہیں وہ دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اداروں میں کم قابلیت والے اور زیادہ قابلیت والے ایک دوسرے کو سرو کرتے ہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر ایک بہترین معاشرہ تکمیل پاتا ہے۔

بقول رفیق بیکون کے، لیڈرشپ، اسلام میں ہر بالغ شخص پر ذمہ داری اور امانت ہے اور ہر لیڈر اور اس کے ماننے والے کا رویہ دراصل اللہ کی ہدایات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وہ آپؐ کی ایک حدیث کا مطلب سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''قوم کا لیڈر اصل میں ان کا سرونٹ ہوتا ہے''۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ نبیؐ کی ہر بات اور حکم کو ماننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جیسا کہ قرآن میں حکم ہوا، ''اللہ اور اسکے رسول کا حکم مانو'' (آل عمران: ۳۲)۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ اسلام میں ''اللہ تعالیٰ سپریم پاور اور علیم ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیئے پیغمبر بھیجے اور کچھ پر آسمانی کتابیں بھی نازل کیں۔ قرآن ان تمام کتابوں میں سب سے آخری اور فائنل ہے''۔ اور یہ کہ ہر پیغمبر اللہ کی طرف سے اللہ کے بندوں پر ایک لیڈر ہی مقرر ہوتا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی لیڈرشپ آج کی بزنس کی دنیا میں بہت مقبول ہے۔ اسپیرز جو کہ گرین لیف کا ادارہ چلا رہے ہیں اور سرونٹ لیڈرشپ کے موضوع پر ایک اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک سرونٹ لیڈر کی گیارہ خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو کہ کافی مشہور ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ، اس قسم کا لیڈر ایک:

(۱) سچا، (۲) دیانتدار (۳) دوسروں کی ضروریات کو اپنی خواہشات پر مقدم رکھنے والا (۴) با مقصد زندگی گزارنے والا (۵) انکی باتوں کو سننے والا (۶) اپنے ساتھیوں کا فائدہ سب سے افضل رکھنے والا (۷) دوسروں کے لئے ایک رول ماڈل (۸) دوسروں کی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ذمہ داری دینے والا (۹) دوسروں کی غلطیاں معاف کرنے والا (۱۰) معاشرے کو تعمیر کرنے والا اور سب سے بڑھ کر (۱۱) دوسروں کی خدمت کرنے والا ہوتا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک کمزور لیڈرشپ ہے جبکہ اس کے برعکس دراصل سرونٹ لیڈر ایک مضبوط لیڈر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ خواتین کا خیال ہے کہ یہ خواتین کے لئے کوئی بہتر لیڈرشپ نہیں ہے۔ جبکہ اسپیرز نے ایک خاتون جن کا نام بوداس ہے، کا ذکر کیا ہے جن کے مطابق ''ہر معاشرے میں خواتین ہمیشہ سے سرونٹ لیڈرز کا کردار نبھاتی آئی ہیں''۔

رفیق بیکون آپؐ کی اس حدیث کہ، تم میں سے ہر شخص ایک راعی ہے اور ہر شخص سے اسکی رعایا (جو کوئی اس کی کیئر میں ہے) کے بارے میں سوال ہوگا، کا مفہوم سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام میں ہر شخص ایک لیڈر ہے اور اپنی رعایا کا ذمہ دار۔ لہذا کسی شخص کے پاس کوئی عہدہ ہونا ضروری نہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو میں اور آپ دونوں ہی لیڈر ہیں لیکن حکم چلانے کے لئے نہیں بلکہ خدمت کرنے کے لیئے اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے تو دراصل ہم سب سرونٹ لیڈر کہلائیں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر میں گرین لیف کے اس دعوے پر یقین کرتی ہوں کہ اس قسم کی لیڈرشپ دراصل اس دنیا کو بدل کر ایک بہتر دنیا بنا سکتی ہے۔ سرونٹ لیڈر بن کر ہم سب نہ صرف دوسروں سے خوشگوار تعلقات استوار کر سکتے ہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی پورا کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس طرح ایک بہترین معاشرہ وجود پا سکتا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ کو ایک سرونٹ لیڈر بننا پسند ہوگا؟ اگر آپ کا جواب ہاں ہے تو خوشی سے اس پر کام کرنا شروع کر دیں، آج ہی سے!

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل مضامین سے مدد لی گئی ہے۔

Beekun, R. I. (2012). Character centered leadership: Muhammad (p) as an ethical role model for CEOs. Journal of Management Development, 31(10), 1003-1020.

Greenleaf, R. K. (1977). Servant Leadership. Mahwah, NJ: Paulist Press

Mawdudi, S. A. A. (????). Towards understanding Islam. Nottingham, UK:

Spears, L. C. (2010). On character and servant-leadership: Ten characteristics of effective, caring leaders. The Journal of Virtues & Leadership, 1(1), 25-30.

☆......☆......☆

قلم کار بہنوں سے

جب تک آپ کا تخلیقی وجود اپنی جمالیات مرتب نہیں کرتا، اس پر تازگی کے بھید کیونکر کھل سکتے ہیں؟

آپ کے سینے میں حساس دل اور ہاتھوں میں قلم ہے جس کے لئے آپ مبارک باد کی مستحق ہیں آپ کو قدرت نے جس کام کے لئے چنا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کو معاشرے اور اس کے تہذیبی نقوش کی بقا کا سامان کرنا ہے اور یہ کام بالا رادہ اور بالالتزام کرنا ہے کیونکہ جس معاشرے نے آپ کو انسانیت کا شعور دیا۔ آپ کو نمو کے تمام تر مواقع بہم پہنچائے، آپ کو اقدارِ حیات سے آگاہ کیا، اس کی بقا اور پاس داری کا احساس سب سے پہلے آپکو کرنا ہے۔ اور احساس سے بڑھ کر ادراک اور اس ادراک کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ آپ اپنے قلم کے ذریعے، اس فن کے ذریعے اس شعور کو اجاگر کریں، کیونکہ آپ کا قلم آپ کے زندہ احساس وشعور کا ترجمان ہے۔

خالق حقیقی اللہ کی ذات ہے اور اللہ نے اس دنیا میں جس کو تخلیق کا فن دیا ہے اس کو بڑی نعمت ودیعت کی ہے اور وہ مقروض ہے خلق خدا کا، اس سماج کا لازم ہے کہ آپ کی تخلیقات میں آپ کی ثقافت اور تہذیب کی خوشبو رچی بسی ہو! تازگی اور توانائی ہونی چاہیے۔ تخلیق کار وہ ہوتا ہے جو ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھ کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔

آپ جاننا چاہیں گی کہ تازگی کا بھید کیا ہے؟ جان رکھیے! زبان اہم ہے، الفاظ اہم ہیں، مواد اہم ہے، ربطِ تحریر اور جملوں کی ساخت بھی اہم ہے جب تک آپ کا تخلیقی وجود اپنی جمالیت مرتب نہیں کرتا، اس پر تازگی کے بھید کیونکر کھل سکتے ہیں؟ آپ جن مشاہدات سے گزرتی ہیں، تجربات سے گزرتی ہیں ان کی جمالیاتی تشکیل کی کوشش کیجئے۔ یہ درست ہے کہ ادیب یا لکھاری اپنے زمانے سے لاتعلق ہو سکتا ہے نہ زمین سے، مگر کسی درجے میں لاتعلقی بھی درکار ہوگی۔ مثلاً آپ کے اطراف میں لوگ جس مادی دنیا کے حصول کو اپنا مقصدِ زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور جن چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں آپ کا ذہنی افق اس سے بلند ہونا چاہیے۔ آپ کو اپنے اندر کے ادیب کو زندہ رکھنے کے لئے سہولت کار بننا ہوگا۔ کبھی اس کے ناز بھی اٹھانے ہونگے۔ جیسے آپ کے مادی وجود کو خیال خاطر احباب درکار ہوتا ہے اسی طرح آپ کے اندر کا ادیب آپ کی توجہ چاہتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ آپ لکھنے کو قلم اٹھاتی ہیں تو موضوع غائب ہو جاتا ہے، مفہوم ملتوی ہوتا ہے اور الفاظ آپ کی گرفت سے دور کھڑے مسکرا رہے ہوتے ہیں۔ یہ کمزوری نہیں۔ ایسا تو بڑے ادیبوں کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ تب قلم کو مجبور نہ کیجئے اس سے تحریر سے وابستہ تقدس مجروح ہوگا۔ تب پڑھیئے اور اچھا پڑھیئے، سوچیے اور اطراف سے بے گانہ ہو کر سوچنے میں بھی حرج نہیں۔ زماں ومکاں کی قید سے بلند تر ہو کر سوچنے میں بھی حرج نہیں۔ البتہ آپ کے قلم سے نکلی ہر سطر مقدس ہے جیسے آپ کی زبان سے نکلا ہر لفظ۔ جب تحریر برائے تحریر ہوتی ہے اور کاغذ کا پیٹ بھرنے کے لئے ہوتی ہے تو ہم بھی بسا اوقات ایسی پڑھی ہوئی تحریروں کو ٹشو پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اور ایسا اس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم اخلاقیات کو مادے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تب آپ جانیں کہ لفظ بانجھ ہو جاتے ہیں اور پیغام مردہ!

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت میڈیا سماج کو وہ سبق پڑھا رہا ہے جو اسے سرمایہ کار پڑھا رہا ہے۔ اس وقت لکھاریوں کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ ہم اس سماج میں زندہ ہیں جہاں ہر شے ''جنس'' ہوگئی ہے حتیٰ کہ خونی رشتے یہاں تک کہ ماں اور باپ بھی۔ اس سماج کا یہ قرض ہے آپ کے حساس قلم پر کہ نئی نسل کو ''جنس'' ہونے سے بچالیں۔ سوچئے بھلا عورت کبھی commodity ہو سکتی ہے کہ سرمایہ داری اس کے

حسن سے منڈی میں اپنی شے کی قیمت کا تعین کرے؟ مگر ہم شب و روز ایسا دیکھ رہے ہیں۔

ہم جو عظیم تہذیب اور علم کے وارث ہیں، اس وقت علم کی جگہ کس چیز کو دی جارہی ہے؟ یقین جانیے علم اور معلومات کی جگہ ''انفارمیشن گاربیج'' نے لے لی ہے معلومات کا ایک سمندر ہے جس میں یہ نسل غوطے لگا رہی ہے جو انٹرنیٹ کے ذریعے بہا چلا آ رہا ہے۔ ہر سیکنڈ ہر لمحے اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں عریانیت بھی ہے بے باکیت بھی، جنسی لطائف بھی ہیں بے ہودہ لغویات بھی۔ کتاب اور قلم سے رشتہ ٹوٹ رہا ہے نوجوان نسل کا۔ ہم تو بخوبی جانتے ہیں کہ ہم سعدی، حافظ، رومی، بابا بلھے شاہ، شاہ عبدالطیف، سچل سرمت، میر، غالب، انیس، اور اقبال کے عظیم ورثے کے حامل ہیں۔ آج اگر وہ دیکھتے کہ ان کے جانشین جنک فوڈ، آزاد کلچر اور کاروباری میڈیا کچن کے قابو میں آ گئے ہیں تو انہیں اپنے پیغام کی پامالی پر کتنا دکھ ہوتا۔ ان سب نے تو اپنی قیمتی زندگیاں ہمیں ''عظمتِ رفتہ'' وخودی کے سبق پڑھانے میں لگا دیں ہمیں بندۂ زمانہ بننے سے بچنے کے راز اور سرفرازی کے گُر بتا کر گئے اور ہم استعمار کے ایجنڈوں کے ہاتھوں اغوا ہو گئے۔

ایسے میں ایک قلمکار، لکھاری، ادیب و شاعر کی ذمہ داری کتنی بڑھ جاتی ہے۔ ہم سے پچھلی نسل جو برصغیر میں غلامی کے دن دیکھ چکی تھی اس وقت کے ادیبوں نے قوم کو ذہنی غلامی سے نکالنے کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان کی جدائی کا غم دیکھا انہوں نے تنکا تنکا خود کو جوڑا اور شعر و ادب کے ذریعے ایک مجروح قوم میں پھر سے زندہ رہنے کا احساس زندہ کیا۔

جو چیلنجز ہماری نسل کو درپیش تھے ہماری نوجوان نسل کو اس سے شدید چیلنجز درپیش ہیں۔ ایک گھر جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو گیا ہو اس کی مرمت اور چیز ہے اور جس گھر میں ڈاکو نقب لگا کر داخل ہو جائیں اس کی حفاظت اور چیز۔ اب جنگیں ملکی سرحدوں پر توپ و تفنگ سے نہیں لڑی جاتیں، اب اصل جنگ تہذیبی جنگ ہے اور جدید ٹیکنالوجی وہ ہتھیار جس کے ذریعے ہماری نسلوں کو اغوا کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ جس عالمی گاؤں کی ہم باتیں سنتے ہیں منصوبہ بندی یہ ہے کہ دل اور دماغ صرف ان لوگوں کے پاس رہنے دیا جائے جوان کے ساتھ ہیں، باقی ہم سب کو انفارمیشن گاربیج میں دھکیل دیا گیا ہے۔ ہمارے ذہنوں کو اب فرصت ہی نہیں کہ ہم اپنی ارادی ذہنی سرگرمیاں تشکیل دیں۔ ہماری انگلیاں ٹچ اسکرینوں پر حرکت میں ہیں۔ ہم وہ دیکھ رہے ہیں جو وہ چاہتے ہیں، ہم وہ سوچ رہے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔ ہمیں لایعنی ذہنی سرگرمیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہم فطرت سے دور ہو رہے ہیں خاندانوں سے دور ہو رہے ہیں۔ آجکا ہر نوجوان نیٹ کی دنیا میں گم ہے، سنجیدہ فکری سرگرمیوں کو ہمارے لیے لایعنی بنا دیا گیا اور ہمیں تفریح کی غلط تفہیم بتائی گئی۔ تفریح کو غیر حقیقی سطح تک اجاگر کیا گیا اور تفریح بھی وہ جو سراسر اخلاقیات کی نفی کرتی ہے۔ تفریح کے جو انداز موبائل فون کے اشتہاروں میں دکھائے جاتے ہیں اسی تفریح کی جانب ہماری نسلوں کو دھکیلا جا رہا ہے۔

لیکن بحیثیت قلمکار جان رکھیئے کہ اس معاشرے کے تہذیبی نقوش کی بقا اب آپ کی اولین ذمہ داری ہے۔ آپ زمین اور زمانے سے لاتعلق ہو کر کسی ادب کی تخلیق نہیں کر سکتیں۔ آپ کو وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے قلم اور صلاحیتوں کو معاشرتی شعور آگہی کی آبیاری کے لئے استعمال کرنا ہے۔ سازشوں سے باخبر رہنا ہماری بصیرت کا تقاضہ ہے۔ مگر برے کو برا کہنے سے کچھ نہیں بدلتا اور صرف برائیوں اور کھوئی ہوئی اقدار کے نوحے سے کچھ حاصل نہیں۔ جان رکھیئے کہ زخم چاٹتے رہنے سے ہم اذیتوں سے لذت کشی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ تہذیبی سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ بہت قابل قدر ہے۔ آپ اس کی امین ہیں اگر آپ کے ہاتھوں میں قلم ہے اور آپ کی فکر، لمدوشِ ثریا، تو پھر آنے والا کل ہمارا ہے، ان شاءاللہ۔

(حریم ادب کراچی میں ہونے والی ادبی نشست میں پڑھا گیا)

☆......☆......☆

میری خالہ جان

۲۰ جنوری ۲۰۱۶ء کو ہماری پیاری خالہ جان، زہرہ خلیق مرزا اپنے ابدی گھر کو روانہ ہوگئیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

ان کے جانے کے بعد سب کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ کس قدر خوبصورت زندگی گزار کر گئی ہیں۔ ان کی محبتیں بانٹتی ہوئی شخصیت کے نمایاں پہلو عبادت اور خدمت تھے جو ان کی پوری زندگی پر محیط رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری و باطنی حسن سے خوب نوازا تھا اور نہایت باوقار انداز میں انہوں نے زندگی کی صبح سے لیکر شام تک کا وقت اس طرح گزارا کہ ان سے منسوب تمام یادیں مثبت اندازِ فکر، مثبت گفتگو اور حسنِ عمل سے عبارت ہیں۔ ان کی زندگی صبر اور شکر کی تصویر تھی۔ وہ بردباری تحمل، شگفتگی کی مثال تھیں۔

جالندھر چھاؤنی میں اپنے والدین کے گھر پیدا ہونے والی وہ تیسری دختر تھیں۔ بڑی دو بہنوں کی رخصتی کے بعد چھوٹے چار بھائیوں اور ایک بہن کے لئے ہمیشہ محبت اور شفقت کا ذریعہ بنیں اور والدہ کی معاون و مددگار۔ چھوٹی بہن (ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا) کا جب شروع میں سکول میں دل نہ لگا اور والدہ نے کہا کہ یہ تو شاید پڑھائی نہ کر سکے تو نہایت شفقت سے ابتدائی کلاسیں گھر میں پڑھا کر بڑی کلاس میں داخل کرایا اور ہمیشہ معاونت کرتی رہیں۔

مدرسۃ البنات جالندھر سے تعلیم مکمل کی اور پاکستان آنے کے بعد بھی اپنی مکتب کی ساتھیوں سے تعلق رکھا۔ مدرسۃ البنات لاہور سے بھی تعلق رکھا اور انکی تقریبات میں بطور خصوصی مہمان شریک ہوتی رہیں۔

ان سے بڑی بہن ماموں کے گھر بیاہ کر گئیں (جنکا متصل گھر تھا) تو بعد میں چھوٹی دو بہنوں کو بھی والدین سے مانگ لیا او یوں رشتے بڑھنے سے محبتیں بھی بڑھتی رہیں۔ قیام پاکستان کی جدوجہد کا مرکز گھر پر تھا کہ سسر (ماموں) ڈاکٹر حمید اللہ بیگ مسلم لیگ کی طرف سے قانون ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور علاقے کے واحد مسلمان ڈاکٹر بھی تھے۔

جب اچانک جالندھر کے پاکستان میں شامل نہ ہونے کی خبر ملی تو اس وقت ڈلہوزی میں تھیں۔ بڑی ہمت اور توکل کے ساتھ جالندھر تک کا سفر کیا جبکہ مسلمانوں کی پوری کی پوری ٹرینیں شہدا سے بھری ہوئی تھیں۔ اس موقع پر کسی نے کہا کہ مصلحتاً برقعہ اتار دیں تا کہ مسلمان ہونے کی شناخت نہ ہو سکے مگر انہوں نے اس رائے کو مسترد کر دیا اور اللہ سے حفاظت کی دعائیں مانگتی رہیں۔ اس طرح جالندھر پہنچ کر خاندان کی دیگر خواتین کے ساتھ لاہور پہنچیں۔ انہیں لاہور بھیج کر انکے شوہر تایا جان خلیق مرزا، جالندھر شہر چھاؤنی سے خاندان کے دیگر افراد کو اپنی گاڑی میں سرحد تک پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ بارڈر بند ہوگیا۔

لاہور میں ۱۰ وارث روڈ پر سارا خاندان جب اکٹھا ہوا تو خالہ جان نے سب کی میزبانی سنبھال لی۔ چونکہ عمارت پہلے ہندوؤں کی ملکیت تھی اس لئے سب کو سختی سے ہدایت تھی کہ تمام چیزوں کو حفاظت سے پیک کر دیا جائے اور ان کی کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے، یہاں تک کہ وہ ہندو فیملی ایک دن آ کر اپنی تمام چیزیں لے گئی۔ چھت کے پنکھے بھی اتار کر انہیں دے دیئے گئے۔

خاندان کے جتنے افراد لاہور میں زیرِ تعلیم تھے، سب کی خدمت کے لئے خالہ جان کمر بستہ ہوگئیں۔ اپنے شوہر، بزرگوں کی انتہائی خدمت گزار، بچوں کی شفیق ماں، خاندان کے تمام افراد کے لئے بھی ماں ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ نسل در نسل ان کی محبت و شفقت کا سلسلہ چلتا رہا۔ بہانے بہانے سے تحفے تحائف دیتے رہنا دور دور بھی تحفے بھیجتے رہنا انکا وطیرہ تھا۔ چہرے پر ہر وقت ایک دائمی مسکراہٹ تھی۔ پڑوس میں جتنی مہاجر فیملیز آباد ہوئیں، ان کے لئے خالہ جان کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی تھی، جو بہانے بہانے سب کو جمع کرتی رہتی تھیں۔ اگر کبھی کسی طرف سے زیادتی کا معاملہ ہوا تو اس کا ذکر تک نہ کیا بلکہ حسنِ سلوک سے دوسروں کا دل موہ لیا۔ حقیقت میں سب ان کے حسنِ اخلاق کے گرویدہ تھے۔

خاطر تواضع ، دوسروں کی ذات میں دلچسپی لینا، کامیابیوں پر خوش ہونا، کسی کے حسن سلوک کی دل سے قدر کرنا، اچھی باتوں کو یاد رکھنا، بار بار دہرانا، خوبیوں کا تذکرہ کرنا، انکا وطیرہ تھا۔ آخری عمر میں بھی بستر کے پاس نمک پارے، بسکٹ، نمکو کے ڈبے ہر وقت بھرے رہتے اور جو بھی ملنے آتا اس کی خاطر تواضع ضرور کرتیں، بلکہ ساتھ بھی دے دیتیں آخری دفعہ ہسپتال جانے تک اس پر عمل پیرا رہیں۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں بہت جلد تہجد کے لئے اٹھتے پایا۔ نماز، تسبیحات، تلاوت سے فراغت پا کر صبح ریڈیو سے ''روشنی'' پروگرام بلند آواز سے لگا دیتیں تا کہ گھر کے دیگر افراد بھی سن سکیں بلکہ ان کی بیٹی نے بتایا کہ صبح ۹ بجے ان کے ریڈیو پر تلاوت لگی ہوتی تو حیرت ہوتی کہ پاکستان میں تو ٦ بجے تلاوت شروع ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ ریڈیو کے چینل سے مختلف ملکوں سے آنے والی تلاوت لگا دیتی تھیں جبکہ نظر بہت کمزور ہو چکی تھی تو اندازے سے کر لیتی تھیں بہت عرصہ بچوں کو باقاعدگی سے قرآن پڑھاتی رہیں اور تعلیم میں مدد کرتی رہیں نظر کمزور ہونے کے بعد، زبانی ہی قرآن پڑھ لیتی تھیں۔ صبح گھر سے باغ جناح اور وہاں کا چکر لگا کر پیدل واپسی کا معمول رہا۔ اس دوران فاطمہ جناح ہاسٹل کے اندر سے گزرتیں تو راقمہ سے ملاقات بھی کر لیتیں۔

ہر کام میں وقت کی پابندی، نظم وضبط انکا معمول تھا۔ ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر رکھی ہوتی اور ہر کام اپنے مقررہ وقت پر ہوتا۔ رسالہ ''بتول'' جانے کب سے ان کے گھر آ تا رہا تھا۔ دین سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں سے ان کو محبت تھی اور دینی محفلوں میں شرکت انہیں محبوب تھی۔ لاہور میں عابدہ گرمانی صاحبہ نے درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو اس میں شرکت کی۔ گھر میں بھی اکثر ایسی محفلوں کا انعقاد کرتیں۔ نعتوں کا بھی شوق تھا اور خوش الحانی سے خود بھی نعت پڑھتیں اور خصوصاً انکی دعا بہت پر اثر ہوتی۔

جب اپنی بہنوں کی محبت میں جہلم بیٹی کے پاس شفٹ ہوئیں تو ان کی محبت نے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر لی ۔ روزانہ شام کو خاندان کے تمام افراد ان کے پاس اکٹھے ہو جاتے ۔ جہاں بزرگوں کی باتیں سنائی جاتیں، قیام پاکستان کے واقعات دہرائے جاتے، کسی کی کامیابی پر مبارکباد ہوتی، کسی کی حوصلہ افزائی ہوتی اور آخر میں خالہ جان سے دعا کی درخواست کی جاتی۔ بعض اوقات دور بیٹھے لوگ بھی اس محفل میں شریک ہو جاتے۔

جب تک لاہور میں رہیں، قیام پاکستان کے بعد سے، حتی الوسع مثبت سرگرمیوں میں شامل ہوتی رہیں۔ گھر کی بے پناہ ذمہ داریوں کے باوجود، دینی اور خدمت کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے والی خواتین سے رابطہ رہتا اور ان کا ذکر سب ہمیشہ بہت عزت و احترام سے کرتے ۔ راقمہ نے جب بھی ایسی کسی سرگرمی میں مدعو کیا ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور شریک ہوئیں۔ لیڈیز کلب، گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن اور دیگر تعمیری اداروں سے رابطے میں رہیں۔

جہلم میں بھی اپنی ہمت سے بڑھ کر مثبت اجتماعی کوششوں میں حصہ ڈالتی رہیں۔ ۱۴ اگست ۲۰۱۵ کو خود سے ہی ایف ایم ریڈیو پر کال کی اور کہا کہ میں قیام پاکستان کے متعلق بتانا چاہتی ہوں اور ۱۵ منٹ تک جاندار آواز میں ریکارڈنگ کروائی۔ تعمیر پاکستان کے لئے بہت مثبت سوچ رکھتیں اور ہر بات سے مثبت پہلو نکالنے کی کوشش کرتیں۔ اپنی زندگی کے دوران انہیں بہت سی بیماریوں سے مقابلہ کرنا پڑا، بہت سے آپریشن ہوئے، بائی پاس، دل کی تکلیف کی وجہ سے کئی دفعہ ہسپتال میں داخل ہوئیں مگر ان کے معمولات میں فرق نہ آیا ہسپتال کے بستر پر لیٹ کر بھی اطمینان سے اپنے معمول کے مطابق اذکار و تسبیحات میں مصروف رہتیں اور ہر آنے والے سے اسی خوشدلی سے ملتیں جیسے اپنے گھر میں موجود ہوں ۔ ہمیشہ خوش رنگ لباس پہنا اور کہتیں کہ میں تم لوگوں کے لئے تیار ہوتی ہوں، مجھے تو بہت کم نظر آتا ہے۔

مثبت سوچ اچھی بات، حسن عمل ہی ساری زندگی انکا شعار رہا آخری سفر پر روانگی سے قبل ان کے چہرے پر جو سکون تھا اس نے دیکھنے والوں کو بھی اطمینان دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی ساری نیکیوں کو قبول فرمائیں، انہیں کئی گنا بڑھا کر انکا اجر عطا فرمائیں مغفرت فرمائیں، ان کی خدمت کرنے والوں کو خلوص اور محبت پر بہترین اجر عطا فرمائیں اور ہم سب کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائیں۔ آمین ☆

شامِ افسانہ

ماہ اکتوبر کی آخری شام ہمارے لیے ایک یادگار شام تھی کیونکہ حریم ادب ضلع وسطی کراچی کی ایک ادبی محفل ''شام افسانہ'' میں ہم شریک تھے۔شام افسانہ کا روایتی طریقہ تو یہ ہے کہ اس میں کسی ایک قلمکار کے افسانے کا مختلف جہتوں سے باریک بینی سے جائزہ لیکر اسے تنقید کی سان چڑھا کر ایک نئی تروتازہ زندگی سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔مگر یہ محفل اس حوالے سے منفرد تھی کہ اس میں پختہ کار قلمکاروں کے کئی افسانے یکے بعد دیگرے سننے کا موقع ملا۔جس نے نوآموز قلمکاروں اور تواتر سے لکھنے والوں، دنوں قسم کے سامعین میں اپنی تحریری صلاحیت کو پرکھنے اوراس میں خوبی پیدا کرنے کا احساس ابھارا۔

محفل کی میزبان ہاجرہ منصور تھیں جنہیں وقفے وقفے سے آنے والے شرکاء وقفے وقفے سے خوش آمدید کہنے پر مجبور کر رہے تھے اور وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ یہ فریضہ انجام دے رہی تھیں۔تلاوت سے آغاز کے بعد ہاجرہ نے افسانے کی اہمیت اور مختصر تاریخ بیان کی۔ان کی میزبانی کی ایک خوبی منتخب شعراء کے کلام پر مبنی مختصر نظمیں اوراشعار کا برمحل استعمال تھی۔محفل کی مہمان خصوصی افشاں نوید صاحبہ تھیں۔صدر مجلس اور منتخب افسانہ نگار بہنوں کے اسٹیج پر تشریف فرما ہونے کے بعد پہلا مختصر افسانہ نیّر کاشف صاحبہ نے سنایا۔''کنگن'' کے عنوان سے تحریر کردہ یہ افسانہ نئی سہاگن کے حوالے سے جذبات نگاری کا سلیقہ اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔طلعت نفیس کے افسانے ''تن داغ داغ لٹا دیا'' میں رشتوں کی حدیں پھلانگنے والے کرداروں کی عکاسی کی گئی تھی۔

روبینہ اعجاز نے ''زبان کا قفل'' کے عنوان سے افسانہ پیش کیا جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ پیسہ کمانے اور بچوں کی لامتناہی خواہشات پر لٹانے کی روش کیا دکھاتی ہے، صائمہ راحت نے حقیقی زندگی میں رونما ہونے والے تلخ حادثے پر مبنی سچا واقعہ ''خوشبو'' کی صورت افسانے کے قالب میں ڈھالا۔اسماء صدیقہ نے ''عام سا قصہ ہے قیامت تو نہیں'' کے عنوان سے سرکاری ہسپتالوں میں عوام کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی عکاسی کی۔موزوں مقام پر کاٹ دار جملوں سے سجی یہ تحریر دعوتِ فکر دے رہی تھی۔توقیر عائشہ کا افسانہ ''حصار'' آج کی تعلیم یافتہ عورت کو پیغام دے رہا تھا کہ مردوں کے شانہ بشانہ نہیں بلکہ محرم مردوں کی حفاظت اور تعاون میسر ہو تو خواتین اپنی صلاحیتوں کو زیادہ اعتماد سے استعمال کر کے کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔

صائمہ عبد الواحد نے یوم آزادی کی نسبت سے اپنا افسانہ ''۱۴اگست'' سنایا اورتعمیر وطن کے لیے سوچنے کا ایک نیا انداز دیا۔افسانے میں جوانی کی صلاحیتیں اورقوتیں بیرون ملک صرف کرنے کے بعد بڑھاپا گذارنے کے لئے پاکستان آنے والوں پر گہرا طنز تھا۔روزنامہ جسارت صفحہ خواتین کی نگراں اور معروف کالم نگار غزالہ عزیز صاحبہ نے اپنا تازہ افسانہ ''ڈائن'' پیش کیا۔تحریر پر تاثیر، دلچسپ اور موزوں مکالموں سے سجی ہوئی تھی۔

فریحہ مبارک نے نٹ کھٹ سی مسکراتی تحریر ''قدموں کی خاک'' سنا کر سامعین کو تروتازہ کر دیا۔بہترین اردو اور بے ساختہ تشبیہات و استعارات سے سجی اس تحریر نے تو محفل ہی لوٹ لی۔یہ آخری تحریر تھی۔تمام تحریریں بڑی دلچسپی اورشوق سے سنی گئیں۔تحریروں پر تبصرے کی کمی محسوس ہو رہی تھی جسے مہمان خصوصی افشاں نوید صاحبہ نے مجموعی تاثر کی شکل میں بیان کر کے بڑے احسن طریقے سے پورا کر دیا۔قلم تھامنے والے نئے اوراس میدان کے پرانے شہ سواروں دونوں کے لئے ان کے خطاب میں بڑی کشش تھی۔

ان کا کہنا تھا کہ اچھا لکھنے کے لئے بہت سا پڑھنا بھی ضروری ہے تا کہ اچھوتے خیال کی تازگی سے نیا پن تخلیق کر سکیں ۔ معاشرے میں موجود منفی رجحانات کے تذکرے ہی نہیں بلکہ مثبت اقدار وروایات کا حسن بھی ظاہر کریں۔قلم کے ذریعے اپنی تہذیب اور تشخص کی خوشبو دور تک پھیلائیے آج کے دور نے رشتوں کو بھی قابل فروخت جنس بنا دیا ہے ہمیں اپنے پاکیزہ اور اثر انگیز افسانوں کے ذریعے نئی نسل کو جنس ارزاں بننے سے بچانا ہے۔

اس موقع پر یوم آزادی کے سلسلے میں ضلع وسطی کے تحت ہونے والے مقابلہ مضمون نویسی کے نتائج کا اعلان کیا گیا۔حریم ادب کراچی کی صدر ثمرین احمد نے انعامات دیئے ۔ صائمہ عبد الواحد، عظمیٰ ابونصر اور نادیہ سیف انعام یافتگان قرار پائیں اور خصوصی انعام بنت الماس کو دیا گیا ۔ بہت سے قلمکاروں کی تربیت کرنے والی بزرگ قلمکار ثریا اقبال صاحبہ کی خدمات کے اعتراف میں سیمی نظیر نے پھول اور تحائف پیش کئے ۔

دعا کے بعد سب مزیدار کشمیری چائے اور لوازمات سے لطف اندوز ہوئے ۔ دل تو چاہتا تھا کہ شرکائے محفل سے باہم ملاقات کی جائے مگر جھٹپٹے کا وقت گھروں کو لوٹ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جاتے اکتوبر کی اس شام نہ جانے وقت میں اتنی برکت کیسے ہو گئی تھی کہ شرکاء نے اس محفل سے اتنا لطف اور فیض اٹھا لیا۔ اور برکت بھلا کیوں نہ ہوتی کہ یہاں خلوص اور چاہت کے کئی رنگ بکھرے تھے۔

☆......☆......☆

شارٹ کٹ

ایسا لگتا ہے گھر کی بلیوں نے بھی چوہوں کو شکار کرنا اس لئے ہی چھوڑ دیا کہ اس کے لئے گھات لگانے کی محنت کرنی پڑتی ہے، اندازے کی درستی اور شکار کو دبوچنے کے لئے مہارت درکار ہوتی ہے، اس سے سہل کام یہ ہے کہ باورچی خانہ سے جو ملے اس پر ہی گزارا کرلو، پیروں میں لوٹ لوٹ کر بے بسی ظاہر کر کے غذا مانگ لو'' دے دے اللہ کے نام پر۔''

نہ جانے بلیوں نے ہم انسانوں سے یہ ادا کب اور کیسے سیکھ لی، عمومی طور پر من حیث القوم ہم بھی محنت اور جفاکشی سے راستہ ہموار کرنے کے بجائے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہنے لگے ہیں، جو بذات خود کوئی برائی نہیں، لیکن ساری توجہ اس پر مرکوز رکھ کر اسی پر انحصار کرنا معاشرے کے دوسرے افراد کے حقوق غصب کر دیتا ہے۔ انسان سوچنے لگتا ہے کون جان ماری کرے، لحاظ دکھائے، مروت کو اپنائے، اخلاق دکھائے اور یوں منزل کے کوس بڑھائے، اس کے برعکس جو چاہو کرو اور فاصلے گھٹاؤ اپنے ہدف سے نزدیک تر ہو جاؤ، جو کہ محض مادی ترقی اور بھرم بازی سے زیادہ کچھ نہیں۔

فی زمانہ کہا جانے لگا ہے کہ محض وہ شخص ایماندار رہ گیا ہے جس کو بے ایمانی کے ذرائع نہیں حاصل۔ پرکشش ترغیبات سے محروم ''بیچارہ'' ہی اخلاق اور اخلاص کے اسباق سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس کی محرومی نے ہی اسکو راہ راست پر رکھا ہے ورنہ مفاد پرستی ایک ناگزیر ضرورت کی طرح تسلیم کی جانے لگی ہے۔ اسی مفاد پرستی کی شارٹ کٹ نے ہر انسان کو دوسرے انسان سے، ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ سے اور ہر فکر کو دوسری فکر سے انتہا درجہ کا شاکی کر دیا ہے۔ کسی کے دل میں ہر اس شخص کے لئے جس سے اسکا واسطہ پڑتا ہے کوئی اچھے جذبات نہیں ہوتے، محض ضرورت کا ناگزیر رشتہ انکو آپس میں تعلق رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم ہدف پا لینے کے لئے صبر اور صلاحیت رکھنے کی بجائے ہر وہ مختصر طریقہ اختیار کرتے ہیں جو کم وقت میں ہمیں مطلوبہ نتائج دے دے۔ نتیجہ ملنا نہ ملنا بھی قسمت کی بات ہے، لیکن اس کے لئے ماہرانہ تیراکی کے بجائے الٹے سیدھے ہاتھ پیر مارنے کے دوسرے نقصانات بہر حال نتھی ہو ہی جاتے ہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ نہ جانے'' میرے ہی ساتھ کیوں ایسا ہوتا ہے، حالانکہ میں ایسا اور میں ویسا۔''

بہت باوقار اور شائستہ نظر آنے والے انسان بھی ایسے شارٹ کٹ اختیار کر جاتے ہیں کہ عمومی انسان سوچتا ہے اگر'' یہ'' ایسا کر سکتے ہیں تو ہم تو ہیں ہی پاپی، مثلاً راہگیروں کو تکلیف میں مبتلا کرنا، گیٹ سے باہر گاڑی کو دھونا جس سے سڑک پر کئی گھنٹوں کے لئے پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی زحمت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد کوڑے کو کسی بھی وجہ کے تحت گھر سے باہر شاہراہ کی زینت بنا دینا فضا کو آلودہ کر کے بیمار ہونے کا شارٹ کٹ ہے۔ جس سے کتنے لوگ کس طرح متاثر ہونگے اس پر سوچنے کی زحمت شاید ہی کبھی کی جاتی ہے۔

اس طرح کی مثالیں ہم سب با آسانی بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بیان تو بہت کچھ کر دیا جاتا ہے شارٹ میسجنگ کا ویسے ہی کلچر عام ہے'' جو چاہو کہہ دو'' چھوٹا سا میسج لیکن بلا کا مہلک اور معنی خیز، بات تو جب ہے جب بلا کا معنی خیز اور خیر آفریں کام چاہے وہ چھوٹا سا کیوں نہ دکھے، ہم کرنے کو تیار ہوں۔ مثلاً لذت کام ودہن کے بعد شاہراہوں پر اسکے ڈبے اور کاغذ وغیرہ بکھیرنا بند کر دیں۔ سڑک کی حالت یا دوسرے انسانوں کا اس معاملہ میں رویہ دیکھنے سے اچھا یہ ہے

کہ میں اس موجودہ ابتر صورتحال میں اپنے حصہ کا کام کروں۔مغرب کیا ماحولیاتی صفائی کا نعرہ لگا تا ہے اور کیا ہم اس کی حسن ترتیب اور صفائی کے معتقد ہیں، یہ فلسفہ تو ہمارے نبیؐ نے ہمیں مدتوں قبل سکھا دیا تھا کہ ''مجھے چھ باتوں میں انبیا پر فضیلت دی گئی ہے'' ان میں سے ایک یہ ہے کہ'' میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا ہے اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جاسکتی ہے۔''

کیا حسین رشتہ انسان کا اپنے سہارے کے ساتھ قائم کر دیا گیا تھا ،مگر ہم ہیں کہ ماحولیات سے اپنا یہ فطری رشتہ جو کہ ہمہ گیری کا تقاضا کرتا ہے محض اپنے ذاتی اثاثوں کے ساتھ جوڑ بیٹھے ہیں۔صفائی بس اتنی جہاں تک زمین میری ملکیت ہے، باقی کا وارث اللہ۔خطرناک بیماریوں کے وائرس پلیں یا تعفن سے مزاج پراگندہ ہوں، صفائی نصف ایمان ہے کہ بس میرا گھر دھول مٹی سے پاک ہے۔

یہ ہمارے مزاج میں بسا منفی شارٹ کٹ ہمیں محض منتشر الخیال سوچوں اور لایعنی تفریحات آشنا قوم بنا چکا ہے۔ہم اسی میں خوش ہیں اور اسی میں مگن!

☆......☆......☆

فکیہہ مریم۔سپین

مرد اور عورت

عورت-اللہ نے تمھیں مجھ پر قوام کیوں بنایا؟

مرد-اس لئے کے میں اس معاشرے کا جسمانی لحاظ سے مضبوط حصہ ہوں مجھے تم پر قوام بنا کر تمھاری حفاظت اور کفالت کا ذمہ دار بنایا

عورت-تم مضبوط حصہ ہو تو میں کیا ہوں؟

مرد-تم اس معاشرے کا خوبصورت حصہ ہو۔تصویرِ کائنات کا رنگ ہو اور اس معاشرے کے مضبوط حصے کو بھی تو تم ہی وجود میں لاتی ہو۔تم میرا قیمتی اثاثہ ہو۔

عورت-کس طرح قیمتی اثاثہ ہوں؟

مرد-جب تم میرے اینٹوں کے بنے مکان کو اپنی توجہ سے گھر بناتی ہو اور اپنی بے لوث محبت سے اس گھر کو میرے لئے جنت بناتی ہو تو کس طرح سے تم میرے لئے قیمتی اثاثہ نہیں ہوسکتی۔

عورت-تم میرے لئے کیا ہو؟

مرد- میں سیپ ہوں اور تم سیپ میں چھپا موتی ہو جس طرح سیپ موتی کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح میں تمھاری حفاظت کرتا ہوں

عورت-کیا سیپ اور موتی الگ الگ رہ سکتے ہیں؟

مرد-ایک دوسرے سے الگ دونوں کا ہی کوئی وجود نہیں رہتا سیپ کے بغیر موتی عیاں ہوجاتا ہے۔وہ کسی کے بھی ہاتھ میں آسکتا ہے اور وہ اس کا من چاہا استعمال کرسکتا ہے۔اسی طرح موتی کے بغیر سیپ بھی ہلکا ہوکر پانی کی تہہ سے نکل کر ساحل کی چادر پر ہر گزرنیوالے کے پیروں کے نیچے آکر ریت میں ہی دب کر فنا ہوجاتا ہے

عورت-تو مرد اور عورت بھی دونوں ایک دوسرے کے لئے سیپ اور موتی ہیں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزم مرد سیپ بن کر عورت کی حفاظت کرتا ہے اور عورت موتی بن کر مرد کو قیمتی کرتی ہے

مرد-عورت کو میری پسلی سے بنایا گیا

عورت-ہاں عورت کو مرد کے دل کے قریب سے بنایا کہ وہ اس سے محبت کرے اسے عزت دے۔عورت کو مرد کے پاؤں سے نہیں بنایا کے وہ اسکی تضحیک کرے اور نہ ہی عورت کو مرد کے سر سے بنایا کہ وہ اس پہ حکمرانی کرے

مرد-جب عورت مرد کے دل کے قریب ہے تو پھر آج عورت کس بات کی مرد سے آزادی چاہتی ہے؟

عورت-جو عورت یہ بات کرتی ہے وہ شعور نہیں رکھتی۔محفلوں کی زینت بننے کو آزادی کا نام دیتی ہے۔وہ اس کی آزادی نہیں ہے بلکہ اسکا معاشرے کی غلیظ اور ہوس سے بھری نظروں سے خود کا استحصال کرنے کی دعوت ہے۔

مرد- بالکل ٹھیک،عورت کا اپنے مرد کی حفاظت میں رہنا اتنا ہی ضروری ہے جس طرح جنگ کے میدان میں اپنی حفاظت کے لئے سپاہی کا زرہ میں ہونا۔

عورت-ہمارے معاشرے کا بگاڑ کس طرح سے ہورہا ہے؟

مرد-دونوں کے ایک دوسرے کے حقوق وفرائض سے کوتاہی کی وجہ سے

عورت-میرے کیا فرائض ہیں تمھارے لئے؟

مرد-ایک عورت کے فرائض میں اپنے شوہر کی اطاعت، وفا، محبت اسکی عزت اور مال کی حفاظت،مشکل وقت میں اسکا ساتھ اور بچوں کی اچھی تربیت شامل ہیں۔

عورت-اگر میں اپنے فرائض خوبی سے نبھاؤں تو کیا معاشرے کا بگاڑ ختم ہوجائے گا؟

مرد-معاشرے کا بگاڑ دونوں کے فرائض پورے کرنے سے ہی ختم ہوسکتا ہے دونوں سے مل کر ہی گھر بنتا ہے جب ہر گھر میں دونوں اپنے فرائض پورے کریں گے تو پورا معاشرہ نفرتوں اور ناچاقیوں سے پاک ہوجائے گا۔

عورت-تو پھر تمہارے کیا فرائض ہیں؟؟

مرد-ایک مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت کے ساتھ نیک سلوک کے ساتھ زندگی گزارے اس کے ساتھ زیادتی نہ کرے اسکی کوتاہیوں سے درگزر کرے اسکی عزت کرے اپنے گھر میں محبت سے رکھے اسکی حفاظت و کفالت کرے بچوں کی بہترین تربیت میں اسکا ساتھ دے۔

عورت-اگر یہ فرائض دونوں پورے کریں تو یقیناً ایک خوشحال گھرانہ وجود میں آئے گا جو معاشرے کیلئے سودمند ثابت ہوگا۔

مرد-اس سب میں تمھارا کردار ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے

عورت-مگر تم میرا ساتھ نہیں دوگے تو میں اپنا کردار بخوبی کیسے نبھا سکوں گی؟

مرد-ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کے ساتھ کی ضرورت ہے آؤ مل کے ایک خوبصورت معاشرہ تشکیل دیتے ہیں

ہر مرد اور عورت اپنے لئے ایک مکمل شریکِ حیات کا خواب دیکھتا ہے مگر اللہ تعالیٰ انہیں کہتا ہے کہ میں نے تم دونوں کو بنایا کہ ایک دوسرے کو مکمل کرو

☆......☆......☆

چند گُر کی باتیں

خوشگوار زندگی کے لئے ضروری ہے کہ گھر کے معاملات باہر جا کر نہ بتائیں، گھر کے معاملے کو گھر میں ہی حل کریں۔ عموماً لڑکیوں میں یہ عادت زیادہ ہوتی ہے کہ میکے جا کر ہر بات بتاتی ہیں اس سے جھگڑے بڑھ جاتے ہیں۔ ماں اور بیوی دونوں کے لئے اہمیت کا حامل ایک شخص ہے اس ایک شخص کو سکون پہنچانے کے لئے ساس اور بہو اپنا معاملہ صحیح رکھیں۔

شوہر یا اس کے گھر والوں سے اچھے بن کر رہنا ہے تو صرف اللہ کے لئے بنیں انسانوں کو ہم خوش نہیں کر سکتے۔ میاں بیوی اپنے مسائل کو آپس میں حل کریں، ان پر بات چیت کریں اور بیوی کو چاہیے کہ وہ شوہر کے بارے میں اس کے گھر والوں اور دوستوں سے بات نہ کرے اور نہ ہی شکوہ کرے اس سے وقار جاتا رہتا ہے۔ شوہر بیوی خاص تعلقات میں ایک دوسرے سے مطمئن نہیں تو کسی اور سے ذکر نہیں کرنا بلکہ آپس میں ہی کھل کر بات کریں کیونکہ اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے کا لباس بنایا ہے۔

شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ جائیں اور نہ ہی گھر پر کسی کو بلائیں شوہر گھر پر ہو تو اس کو وقت دیں اس سے بات کریں اور اس کی موجودگی میں اپنے فون کو زیادہ استعمال نہ کریں، لمبی لمبی بات چیت نہ کریں۔ عورتوں کو شکایت ہوتی ہے کہ خاوند ہم سے بات نہیں کرتے عموماً اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب وہ گھر پر ہوتے ہیں تو بیویاں فون کا استعمال کرتی ہیں یا پھر کچن کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ جب شوہر گھر پر ہیں تو ان سے باتیں کریں اور ماحول کو بہتر بنائے رکھیں۔ فراغت میں علیحدگی میں بیٹھیں، ان کے مشاغل جانیں اور ان میں دلچسپی لیں اور ان کے ساتھ دوستانہ طریقے سے رہیں۔

شوہر جب دفتر کے لئے جائے تو اس کے پاس رہیں۔ شوہر کی ہر چیز تیار رکھیں۔ اچھے انداز سے اسے گھر سے رخصت کریں۔ اس کے لئے کھانے کے ڈبے میں کوئی اچھا سا خط رکھ دیں۔ پھر دیکھیں کہ آپ یوں کریں گی تو شوہر کا دن اچھا گزرے گا اور اس کو گھر آنے کی جلدی ہوگی۔

شوہر کے گھر آنے سے پہلے گھر کو صاف ستھرا رکھیں۔ بعض بیویاں شکایت کرتی ہیں کہ ان کے شوہر گھر سے باہر ٹھیک ہوتے ہیں اور گھر آتے ہی غصہ کرتے ہیں۔ اگر دیگر معاملات درست ہیں تو اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ گھر گندا اور بے ترتیب ہوتا ہے اس کے برعکس اگر شوہر کے گھر آنے پر بیوی صاف ستھری خوش لباس ہو، گھر سے کھانے کی خوشبو اٹھے، بچے پڑھ رہے ہوں، گھر بھی صاف ستھرا ہو تو شوہر بھی خوش رہے گا۔

سب کاموں کے ساتھ ساتھ خود پر بھی توجہ دینی چاہیے اچھا رنگ پہنیں جو شوہر کو اچھا لگے، خوشبو لگائیں۔ شوہر اگر غصہ کرے تو جواباً خاموش رہنے سے بات نہیں بڑھتی اور اگر بیوی کو غصہ آجائے تو چاہئے کہ اپنے غصے کو کسی اچھے کام میں لگائے، خود کو مصروف کرلے۔

شوہر سے محبت کا اظہار کریں، انکو بتائیں کہ وہ آپ کے لئے کتنے اہم ہیں۔ وہ آپ کا کوئی کام کردیں یا گھر کا ہی سودا لا دیں تو آپ انکا شکریہ ادا کریں۔ جتنا بھی آپ کے شوہر آپ کے لئے کریں اس میں شکر گزار رہیں۔

کبھی کبھی اپنے شوہر کو کوئی گفٹ دیں ان کے لئے گھر میں کوئی خاص کھانا پکالیں ان کی پسند کے کھانے ان کو بنا کر کھلائیں شوہر کو علیحدہ وقت دیں، ان کی باتیں سنیں اور بات چیت کریں۔ ان کے ساتھ کوئی

کھیل کھیلیں۔شوہر اگر دوستوں کے ساتھ جانا چاہیں تو اعتراض نہ کریں ،انہیں خوش ہونے دیں، ویسے بھی آدمی تروتازہ محسوس کرتے ہیں جب وہ اپنے دوستوں میں ہوتے ہیں۔شوہر گھر پر واپس آئیں تو خوش مزاجی سے ملیں، ان کے سامنے غمگین چہرہ نہ لے کر جائیں۔دن بھر کے مسائل آتے ہی نہ بتائیں ان کو کھانا دیں، آرام کرنے دیں اور پھر ان سے کوئی معاملہ ہو تو بتا دیں۔شوہر کے جذبات ہوتے ہیں اور اگر ہم انہیں نہیں سمجھیں گے تو تعلق کمزور پڑ جائے گا شوہر میں ایک بچپنا ہوتا ہے اور بعض اوقات بچوں کی طرح ہی ان سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔

آپس میں ایک دوسرے کو نیکی کی ترغیب دلائیں اور اچھے بنیں۔

صبر کا مادہ ہونا ضروری ہے صحابیہ ام سلیمؓ کا بیٹا بیمار تھا اور ان کے خاوند کی غیر موجودگی میں فوت ہو گیا ان کے شوہر شام کو کھیتوں سے گھر آئے، آتے ہی پوچھا بیٹا کیسا ہے۔انہوں نے کہا پہلے سے بہتر ہے اور خاوند کو کھانا دیا۔پھر وہ تیار ہوئیں اور خاوند کی خواہش پوری کی۔پھر صبح ہونے سے پہلے کہنے لگیں، اگر کسی نے آپ کو کوئی امانت رکھوائی ہو تو آپ سے وہ واپس مانگے تو آپ کیا کریں گے۔انہوں نے کہا میں خوشی خوشی واپس کر دوں گا۔کہنے لگیں اللہ نے ہمیں امانت دی تھی تو اس نے واپس لے لی اور یہ کہ ہمارا بیٹا ساتھ کمرے میں مردہ پڑا ہے۔یہ سن کر وہ رسول اللہؐ کے پاس گئے اور سارا معاملہ بیان کیا آپؐ نے فرمایا، اس نے بالکل ٹھیک کیا اور اللہ نے تمہارے لئے اس عورت میں برکت کی۔پھر اللہ نے انہیں بہت پیارا اور نیک بیٹا عطا کیا۔

اپنے صبر کو مزید بڑھائیں اور اپنے رشتے کے لئے اللہ سے دعائے خیر بھی کرتے رہیں۔کوشش اور دعائے خیر سے ازدواجی زندگی بہتر رہے گی انشاءاللہ۔

☆......☆......☆

محشر خیال

کرامت بخاری۔ لاہور

آپ کے بتول کے لئے پہلے بھی حاضری لگوائی ہے اور اس ماہ کے لئے دوبارہ ایک غزل روانہ کر رہا ہوں۔ اللہ کرے یہ روشنی پھیلتی رہے۔ آپ پرچے کو اعتدال توازن ،تسلسل، اور تواتر سے رواں دواں رکھے ہوئے ہیں، یہ آپ کی محنت اور خلوص کا نتیجہ ہے۔

خواتین اور بچیوں کی ذہنی تربیت ،مغربی یلغار سے بچانا اور اسلامی آداب ،تہذیب اور ثقافت سے آشنا کرنا جتنا آج ضروری ہے پہلے کبھی نہ تھا۔ انٹرنیٹ ،ای میلز ،کمپیوٹر ،موبائل ،فیس بک وغیرہ نے جہاں انسان کو آسودگی مہیا کی ہے وہاں یہ راستے برائی اور غلاظت سے بھی اٹ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ ہمیں بہت محنت کرنا ہوگی۔

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ۔ گوجرہ

اس دفعہ کا بتول الحمدللہ سات تاریخ کو مل گیا تھا۔ اللہ بھلا کرے عبد اللہ صاحب کا ،میرا اشارہ میری بے قرار صفت کو دیکھ کر جلدی بھجوا دیتے ہیں (دوسری صورت میں درجن بھر فون بھی انہی کو اٹینڈ کرنا پڑتے ہیں) خیر ،اس دفعہ کا بتول بہت سی خوشگوار حیرتیں سامنے لے کر آیا ہے۔

پہلی حیرت محشر خیال ہے۔ اتنی دھند اور سردی کے باوجود خوب حشر برپا ہے۔ دامن بھی بہت کشادہ ہے۔ بہت سے معتبر نام ہیں۔ پیارے بتول کے پرانے دور میں اللہ بخشے پروفیسر اسرار احمد سہاوری صاحب ہر ماہ محشر خیال میں حاضری دیا کرتے تھے جو کہ بالعموم ''سب اچھا'' پر مشتمل ہوتی۔ کوئی ایک دو مستقل نام ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو یہ سلسلہ نبھائیں۔ پرانی تحریر پر تبصرہ گڑے مردے اکھیڑنے یا یوں کہیے ٹھنڈا پراٹھا کھانے کے مترادف ہوتا ہے۔ افشاں نوید کی حاضری بھی بہت اچھی لگی۔

بتول میگزین کے تحت تحریریں گو کہ ،تمہارے لئے مغز کھپائی ہوتی ہوں گی مگر ان تحریروں کے عکس میں مستقبل کے لکھاری چھپے ہوتے ہیں جیسا کہ اس دفعہ نسیم الٰہی کی منظر کشی اور جزئیات نگاری اور نازیہ خان کی سلاست پر مشتمل تھی۔

خط لکھنے کا محرک دو تحریریں ہیں۔ ایک تو نیویارک میں چند روز کی تیسری قسط اور دوسری خواتین کے حلقہ ہائے دروس۔

اس دفعہ سفر نامہ کی قسط معلومات اور فکری (فقری بھی کہہ سکتے ہیں) بے ساختگی میں کمال تھی۔ امریکہ کے بہت سے سفر نامے پڑھے لیکن ''بھیک منگتے'' امریکہ کا روپ پہلی دفعہ کسی سفر نامہ نویس نے پیش کیا، بہت خوب! اشعار کے چناؤ کے لئے برمحل ، برجستہ ،عمدہ ، زبردست کے الفاظ کم ہیں۔ واقعی ہر دو معنوں میں لطف آ گیا۔ میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں روبرو بٹھا کر اتنے سوالات کروں کہ ایک سفر نامہ+انٹرویو مزید تصنیف ہو جائے ...... پانچ اقساط ہوں یا چھ سات، بہر حال آخری قسط تک یہ سفر نامہ کتابی صورت میں آجانا چاہئے۔

خواتین کے حلقہ ہائے دروس ، بہت محنت سے ترتیب دیا گیا مضمون ہے۔ میں اس کے مندرجات سے 99.99 اتفاق کرتی ہوں۔ مضمون کی خاص بات مسائل بیان کرنا نہیں ،تجاویز بھی شامل ہیں۔ اور یہ بھی کہ درس دینا خداداد صلاحیت تو ہے ،ہی لیکن آرٹ اور ہنر بھی ہے۔ مخاطب کی ذہنیت کو سامنے رکھنا اور ان کے اصل مسائل سے آگہی ، دلسوزی کے ساتھ ان کا حل دینا ،جسمانی معالج سے کہیں بڑھ کر روحانی معالج بننا ہے۔ حلقہ ہائے دروس میں تجوید قلقلے اور گرائمر سے کہیں زیادہ قرآنی آیات کے اصل مفہوم اور موجودہ حالات میں ان کے مفاہیم و مطالب کو ٹارگٹ رکھنا چاہیے۔ الحمدللہ پھر رزلٹ ایسا آتا ہے کہ سننے والے کہیں آگے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سیدّ مودودی کی اہلیہ نے کہا تھا کہ قرآنی آیات تو ہماری زندگیوں میں پیش آنے والے روزمرہ کے واقعات ہیں۔

حقیقت و افسانہ میں بھی افسانے عمدہ ہیں (میرے افسانوں کے

سٹاک میں کمی تو نہیں ہو گئی میرے ریکارڈ کے مطابق کچھ ابھی منتظر اشاعت ہیں)

خفتگانِ خاک کے تحت ڈاکٹر رخسانہ جبیں کا اپنے والد (مرحوم) پر مضمون ان کی مومنانہ زندگی پر موثر تحریر تھی۔ اللہ غریق رحمت کرے، ان پر دل کو چھونے والی تحریر تھی۔

''بتول دیارِ غیر میں'' چند ایک کتابت کی غلطیاں ہیں سن ۲۰۱۲ کو ۲۰۲۱ء اور ۲۰۱۵ کو ۲۰۵۱ تحریر ہے۔ یہ غلطی ہضم نہیں ہوئی۔

کئی ماہ سے ذروہ احسن غائب ہیں۔ خیریت؟

☆ قانتہ! اسرار سہاوری تو چلے گئے۔ اب تو یہ صلیبیں ہمارے ہی کندھوں پر آپڑی ہیں۔ اگر صائمہ مدیرہ ہو سکتی ہے تو قانتہ اسرار صاحب کی جگہ کیوں نہیں لے سکتیں؟ (ص۔ا)

☆......☆......☆

فرحت طاہر۔ کراچی

اس دفعہ (جنوری) بتول حیرت انگیز طور پر ۱۱ جنوری کو ہی مل گیا مگر مصروفیات زمانہ نے خط لکھنے کے لیے مہلت نہ دی۔ اور بالآخر وہ تاریخ آ گئی جس کے بعد لکھنے کا مطلب اگلے شمارے تک اس خط کو جگہ ملے گی۔ یہ سوچ کر قلم اٹھا ہی لیا۔ مختصر سہی مگر کچھ نہ کچھ ضرور کہنا ہے، کہیں ایسا نہ محسوس ہو کہ دوسروں کو جگا کر خود سو گئیں......جی ہاں! اس دفعہ محشر خیال میں خاصی گہما گہمی نظر آئی۔ اس ہلچل کا کریڈٹ ہم ہرگز نہیں لے رہے کیونکہ آگ دونوں طرف لگی ہے کے مترادف سب ہی بس اونگھ رہے تھے سوئے ہرگز نہیں تھے۔ ایک ہی پکار پر جاگ گئے اور قلم اٹھالیا۔ اللہ کرے یہ ہمیشہ رواں رہے!

سب سے زیادہ خوشی سمیحہ راحیل اور عابدہ فرحین کی تحاریر پڑھ کر ہوئی کہ بتول سے تجدید تعلق کی شکل نظر آئی، اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود قارئین بتول کے لیے وقت نکالا۔ آپ جیسی خواتین کے پاس تو کہنے کے لیے بہت کچھ مواد ہے۔ اسے کسی طرح ضرور قلم زد کر کے فکر و آگہی کا خزانہ بڑھانے کی فکر ہو۔ بہتر ہو گا کہ کچھ نوجوان ساتھی بطور معاون اس مہم میں حصہ لیں کہ تربیت کے ساتھ فکر کی منتقلی بھی ہو۔

مستقل قلم کار ہرگز ناراض نہ ہوں! ان کے تو لفظ موتیوں سے مہنگے مول ہیں...اس مختصر وقت میں تبصرہ ممکن نہیں مگر ہر تحریر اپنے اپنے مقام پر اعلیٰ ہے۔ عافیہ رحمت کا بچپن بہت بھلا لگا! صائمہ اسماء کا سفر نامہ محض یادداشتیں نہیں بلکہ فکر و نظر کے بہت سے پہلو کھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تنقیدی اور تقابلی جائزہ کسی بھی سفر نامے کو ایک اہم دستاویز بنا دیتا ہے۔

ماہ جنوری کے شمارے میں جہاں کچھ مستقل قلم کاروں کی کمی لگی وہیں کچھ گم گشتہ قلم کار بھی دریافت ہوئے۔ اچھا شگون ہے۔ اللہ کرے بتول کی تروتازگی روز افزوں ہو اور یہ نسل در نسل خواتین کی دلچسپی کا محور رہے، تربیت کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی تسکین بھی کرتا رہے۔ آمین

☆......☆......☆

مریم فاروقی۔ لاہور

بتول ہمارے لئے ایک خزانے کی طرح ہے جس میں سے ہم اپنی پسند کے جواہرات نکال کر استعمال کرتے رہتے ہیں جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑنے والی۔ پچھلے بتول بھی سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں شدید بیماری کے بعد اللہ نے دوبارہ زندوں کی لائن میں شامل کیا اللہ کا فضل ہے۔ اس حال میں یہ رسالے میرے رفیق سفر رہے نئے جذبے اور حوصلے دیتے رہے۔ مایوسی سے نکال کر امیدوں کی روشنی اسی سے ملی۔ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کے ایک پرانے لکھے ہوئے مضمون سے بہت تقویت ملی اللہ پاک سب لکھنے والوں کو بے انتہا جزا دے محترمہ ثریا اسما کا سفر نامہ سوڈان کئی بار پڑھ چکی ہوں بچیوں کو سنا چکی ہوں گزشتہ مہینوں میں انڈیا کا سفر نامہ اپنے ماضی کے جائزے کے ساتھ حال کو بہتر بنانے کا درس دے رہا ہے بتول کے سب سلسلے اول سے آخر تک متاثر کن ہوتے ہیں۔

محترمہ فرحت طاہر کے خط نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ عرض یہ ہے کہ قلم پکڑنے کا سلیقہ نہیں اس لئے لکھنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ سچی بات تو ہے کہ آپ کی سلائی مشین اور والدین پر لکھے گئے مضمون کو بار بار پڑھا ہے کہ تا کہ ہمارے اندر بھی ایسی خصوصیات پیدا ہو جائیں کہ ہم بھی کسی کی دعاؤں میں یاد آ سکیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ جیسے ہی لوگوں کے سائے میں پل کر جواں ہوئے ہیں۔ مسعودہ افضل صاحبہ، سلطانہ صاحبہ،

قراۃ العین صاحبہ، حمیرہ احتشام صاحبہ۔ اب ہماری والدہ محترمہ کو تو دنیا سے گئے ہوئے پندرہ سال ہوگئے ہیں۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ انکے سلسلے بعد والے اپنے اپنے انداز سے جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ہر ایک کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ آپ کی ''نور'' میں لکھی ہوئی کہانیاں ہمارے بچے خاص طور پر پڑھتے ہیں۔ ان کی سہیلیوں میں بھی رسالہ گردش کرتا رہتا ہے۔ آپ سب لکھنے والے قابل صد مبارکباد ہیں کہ بغیر صلے اور ستائش کی تمنا کے اپنے اللہ کی رضا کے لئے مصروف عمل ہیں۔

ابھی صرف بتول کے افسانے اور سفر نامہ ہی دیکھا ہے۔ قانتہ رابعہ کے افسانے ''غیرت'' نے بھی متاثر کیا اور ایک دو جگہ تبصرے میں بھی آ گیا۔ یہ رسالہ ایسا ہے کہ اس کی ہر چیز منفرد ہے اور ہمارے معاشرتی حالات پر چسپاں ہوتی ہے۔ بہت دن تک تبصروں میں ملاقاتوں میں رسالہ اپنی تحریروں کے حوالوں کے ساتھ موضوع گفتگو بنتا رہتا ہے۔

☆......☆......☆

زینب وسیم قائم خانی۔ کراچی

کیا کہنے شاعرات اور شاعر حضرات کے، یہ لوگ تو جب بھی شعر کہتے ہیں در اصل ہمارے دل مضطرب کا حال کہتے ہیں۔ ہمیں خود جب جب دل پہ جو جو گزری ہمیشہ ہی ہر ماہ بتول کی غزلیں اور نظمیں مکمل ترجمانی کے ساتھ آدھمکتی ہیں تو ہمیں مجبوراً قلم واپس رکھ دینا پڑتا ہے جیسا کہ اس مہینے کیا خوب کہا حبیب الرحمٰن صاحب نے:

ہے دل تیرا کام یہی
دھیمی دھیمی آنچ میں جل

اور ذکیہ فرحت:

ہو جتنی دیر میں ہم سے یہ داستان رقم
وہ اتنی دیر میں کرتے ہیں ایک اور ستم

شمیم فاطمہ کی ام المومنینؓ پر نظم قابل تعریف ہے محمد اکرم طاہر کا معاشی اسوۂ حسنہ پر مضمون سیرت کے ایک نہایت اہم پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ میرے افسانے کا نام نوٹ کر لیں ''سستی تفریح'' شائع ہوا، بتول جولائی 2006ء میں، براہ کرم تلاش کر دیجئے۔

☆زینب وسیم قائم خانی! آپ کی تحریر ''سستی تفریح'' بتول 2005ء کے ماہ فروری شمارے میں ہے۔☆

سحر شہزاد۔ ملتان

ایک مہینہ تاخیر سے تبصرہ لکھنے پر معذرت کیونکہ چھوٹے بچوں کی وجہ سے میں بتول پڑھنے میں ایک مہینہ پیچھے ہوں (یعنی دسمبر کا بتول جنوری میں مکمل کیا)

میر بابر مشتاق صاحب کا مضمون ''طیب اردگان کا ترکی'' بہت ہی زبردست لگا۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا اور استنبول کے فٹ پاتھ پر اخبار بیچ کر گزر اوقات کرنے والا نوجوان جب حکمرانی کے تخت پر بیٹھتا ہے تو اپنا مشکل وقت یاد رکھتے ہوئے اپنے عوام کی آسانیوں کے لئے بے شمار فلاحی کام کرتا ہے کیونکہ اس کے پاس ایمان اور احساس ذمہ داری جیسی عظیم دولت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو بھی نیک صالح اور دوسروں کا درد رکھنے والے حکمران عطا فرمائے اور ہم جیسی نام کی مسلمان رعایا کو بھی حقیقی مسلمان بننے کی توفیق دیں۔ آمین

افشاں نوید کا مضمون دو متوازی دھارے فکر انگیز ہے۔ واقعی دینی اور دنیاوی علوم دو الگ الگ بہنے والی نہریں ہیں۔ میں سمجھتی ہوں اس معاملے میں ہم ماؤں کا یعنی گھریلو تربیت کی کمی کا قصور ہے۔ ہم نے خود ہی اپنے بچوں کو دین سے دور رکھا ہوا ہے اور دنیاوی تعلیم کی اہمیت بچپن سے ہی ان میں راسخ کر دی جاتی ہے۔ ''دی علم فاؤنڈیشن'' کے زیر اہتمام طلبہ کی قرآنی تعلیمات سے آگاہی کے لئے ایک جامع نصاب (مطالعہ قرآنِ حکیم برائے طلبہ و طالبات) مرتب کیا گیا ہے جس سے پاکستان کے سینکڑوں سکولز جن میں تقریباً 2لاکھ سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں، استفادہ کر رہے ہیں۔

بتول کے توسط سے جو قارئین اپنے سکولز یا اکیڈمیز چلا رہے ہیں میں ان سے درخواست کرونگی کہ وہ بھی یہ نصاب اپنے سکولز میں ضرور شروع کروائیں تاکہ تیسری جماعت سے لے کر میٹرک تک پڑھنے والے بچے جب ہمارے سکولز سے نکلیں تو انہیں قرآن کا ضروری علم ہو۔

اس نصاب کے متعلق مزید معلومات جاننے کے لئے اس ویب سائٹ: Website www.tif.edu.pk پر ضرور Visit کیجئے تاکہ اس نیک کام میں ہم بھی حصہ ڈال سکیں۔

☆......☆......☆

☆عذبہ حنیف (شرقپور) آپ نے جو کہانی بھیجی ہے اس کے رائٹر کا نام اور رسالے کا حوالہ بھیج دیں تا کہ وہ شائع ہو سکے۔

بتول میگزین

اظہارِ تشکر کا ایک انداز یہ بھی ہے

فریدہ خالد۔شیفیلڈ

میں بشریٰ کنول (وہ احساس کا لمحہ، جنوری 2015۔ ویب سائٹ) سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ واقعی اگر اللہ نے ہمیں لکھنے کی صلاحیت سے نوازا ہے تو ہم سب کو کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیے۔ کیا معلوم ہماری لکھی ہوئی کوئی بات کسی کے لئے کیا اثر رکھے اور اس کی زندگی میں کیا مثبت فرق لائے۔ اب یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے کہ نہیں۔ یہ معلوم کرنا ہمارا کام ہے کوئی اور ہمارے لئے یہ کام نہیں کرسکتا۔ ہاں چند ایک ٹپس جو کہ میں نے اپنے تجربے سے سیکھی ہیں حاضرِ خدمت ہیں۔

سب سے پہلے جو کچھ لکھنے کا ارادہ ہو اسکی ایک آوٹ لائن بنا لیں۔ لکھنے سے پہلے اپنے موضوع کے بارے میں پڑھنا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا آپ پڑھنے کی عادت بھی ڈالیں۔ اپنے موضوع سے متعلق اچھی کتابوں کا مطالعہ کریں، اپنے دل کی بات پڑھنے والوں کے لئے سبق آموز اور دلچسپی کے انداز میں لکھ لیں۔ اس کے علاوہ محترمہ صائمہ اسما صاحبہ کا مارچ 2011 کا اداریہ صفحہ نمبر ۲ پڑھیں (ویب سائٹ پر موجود ہے) جس میں انہوں نے بہت ہی آسان الفاظ میں، بتول میں ''اپنی نگارشات بھیجنے والوں سے چند گزارشات'' کی ہیں۔ ان پر عمل کریں۔ اپنی طرف سے بہترین انداز میں لکھنے کے بعد اپنی کسی اچھی ساتھی کو پڑھنے کے لئے دیں اور اسکا فیڈ بیک شامل کر کے مضمون کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں (میں نے اپنا پہلا مضمون کئی ایک ساتھیوں کو پڑھوایا اور پھر فائنل لکھ کر بھیجا تھا)۔

ضروری نہیں کہ آپ کا پہلا مضمون چھپ جائے مگر مسلسل کوشش کرتے رہنے سے لکھائی میں نکھار ضرور آئے گا۔ آزمائش شرط ہے۔

میری لکھاری ساتھیوں سے بھی گزارش ہے کہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو ضرور لکھنے کی طرف مائل کریں۔ نازیہ بھی آج کل ایک مضمون لکھنے کی کوشش میں مصروف ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ جلد ہی اسکا مضمون پڑھ پائیں گے۔ اگر ہم کسی ایک ساتھی کو بھی لکھنے کی طرف مائل کرسکیں تو یقیناً بڑی بات ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بھی انسان کی نیت اور کوششوں کا اجر دیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بتول کے تمام لکھاری ساتھی قلم سے اس جہاد میں اپنوں کو ضرور شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔ انشاءاللہ۔

......☆......☆

ہم دکھ رکھتے ہیں

جویریہ ندیم۔کراچی

''کشمیر''......اس لفظ سے ایک عام انسان کے ذہن میں کیا خیال آتا ہے؟ یہی کہ جہاں لاشیں گرتی ہیں، مائیں روتی ہیں، بچوں کا بے دردی سے خون ہوتا ہے جہاں نہ کسی کو جان کا تحفظ ہوتا ہے نہ عزت کا، جہاں انسانوں کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا ہے، جہاں آنسوؤں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جہاں چیخوں اور آہوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا، جہاں ہر طرف صرف خوف کا راج ہے، ایک عجیب اندھیرا ہے......

آج اگر کسی بچے سے پوچھو کہ ۵ فروری کو کیا ہوا تھا تو وہ یہی بتائے گا کہ ''کشمیر ڈے'' ہے مگر یہ کوئی نہیں بتائے گا کہ وہاں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں ہم نہیں بتاتے اپنی نوجوان نسل کو کہ کیسے ہمارے بے قصور اور مظلوم بھائیوں کو قید میں رکھا جا رہا ہے۔

۵ فروری ہر سال آ کر ہم سے سوال کرتا ہے کہ کیوں ہمیں اس کی آہوں کی آواز نہیں آتی؟ کیوں ہم اپنے ہی بھائی کا درد محسوس نہیں کر

پاتے اور صرف تسلی دینے اور امید بندھانے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ ہاں ہم دکھ رکھتے ہیں......

ہر سال کی طرح اس سال بھی ضرور اخباروں اور رسالوں میں اس دن کشمیر کا ذکر ہوگا مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے یا ہمارے ساتھ ایسا ہوتا تو کیا ہوتا!

☆......☆......☆

کشمیر کا مجاہد

زینب سیم قائم خانی

اک پھول کی طرح تھا
شمشیر ہوگیا ہوں
میں موت سے گزر کر
ہر زندگی کے رخ کی
تصویر ہوگیا ہوں
ہرزخم سے نکھر کر
تعمیر ہوگیا ہوں
جو مندروں میں گونجے
تکبیر ہوگیا ہوں
دشمن کے پاؤں کی میں
زنجیر ہو گیا ہوں
اک خواب تھا کبھی میں
تعبیر ہو گیا ہوں
اے گل زمین تیری
تقدیر ہو گیا ہوں

☆......☆......☆

اتنی سی بات پر!

مریم فاروقی ۔ لاہور

ہمارے آس پاس کے علاقے میں دو تین سال کے عرصے میں 3 بچیوں کی خودکشی کے واقعات نے دل کو بہت تکلیف پہنچائی ہے آج کا تازہ واقعہ کچھ اس طرح سننے میں آیا کہ بچی کے والد نے اسے کہا کہ جو کالج آپ چاہتی ہو وہ میں افورڈ نہیں کر سکتا اس لئے دوسرے کالج میں داخلہ لے لو لیکن اس کی گھر میں بہن اور والدین سے بھی بحثا بحثی ہوگئی۔ اس سے دلبرداشتہ ہو کر اس نے پہلے دودھ میں زہریلی دوائی ملا کر لی لیکن جلدی کچھ اثر نہ ہوا تو پھر دوپٹے کا پھندا پنکھے کے ساتھ بنا کر اپنی جان کا خاتمہ کر لیا۔

دو سال پہلے جو حادثہ ہوا وہ سکول ٹیچر تھی، ایف اے یا بی اے تک تعلیم تھی۔ میری دوست تھی بس سلام دعا کی حد تک۔ خوش شکل تھی لیکن والدین کے ساتھ پسند کی شادی پر ٹکراؤ ہوا اور دلبرداشتہ ہو کر زہریلی دوائی لے لی جس سے ناک کے ذریعے خون آنا شروع ہوگیا۔ اسی سے جان ختم کر لی۔ جب یہ سنا تھا تو دل کو بہت تکلیف پہنچی تھی۔ جب بھی اس کا چہرہ یاد آتا ہے دل غم سے بھر جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک رشتے کا ماموں یاد آ گیا جو عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا۔ اپنے گھر میں لاڈلا تھا۔ جب بھی وہ نانا جی کے گھر اپنی والدہ کے ساتھ آیا کرتا میں اسے بہت رشک سے دیکھتی تھی کہ اسے سب گھر والے کیسے لاڈ کرتے اور اس کی ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ اس نے بھی اپنے ماں باپ سے کسی بات پر ناراض ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ جب سنا تو دل کو بہت دھچکا محسوس ہوا تھا۔ اب بھی اسکا سراپا یاد آتا ہے تو دل رنج سے بھر جاتا ہے۔ کیسے خوبصورت چہرے اپنی نادانی سے خوشیوں اور سلامتی کے راستے سے منہ موڑ گئے۔ اپنے بڑوں کی بات نہ مانی نہ ہی اپنے مالک کے راستے پر چلے۔ حسرتناک موت سے دوچار ہوگئے۔

آج تو دل بہت دکھی اور اداس ہو رہا ہے کہ الٰہی! ہمارے معاشرے کو کیا ہوگیا کدھر جائیں۔ قوم کا بیڑہ ڈبونے میں میڈیا کچھ کم ذمہ دار نہیں۔

ہمیں اپنی اپنی جگہ اپنی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ چار تعلیمی اداروں میں جو کچھ اصلاح کا پروگرام میں کر سکتی ہوں اللہ مجھے کرنے کی توفیق دے۔ آمین

☆......☆......☆

روزگار کی تلاش

دینی محفل میں خاتون عقیدت ومحبت کے پورے جوش وجذبے سے اولیاءاللہ کی کرامات سنارہی تھیں۔ساری خواتین ایک ایک کرامت پر جھوم اٹھتیں،سبحان اللہ سبحان اللہ کی آوازوں سے کمرہ گونج اٹھتا۔کس طرح ایک ولی ایک ٹانگ پہ دنوں تک کھڑا رہا۔کنوئیں میں ہفتوں لٹکا رہا۔اڑ کر فلاں مقام سے فلاں مقام تک پہنچ گیا......آخر میں اولیاء کے بارے میں یہ حتمی نتیجہ نکالا گیا کہ''وہ ہم جیسے عام انسانوں سے کہیں بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں،ان تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔''

ایسی باتیں سن کر سوچنے والے ضرور سوچتے ہوں گے کہ نبی اور رسول تو عام لوگوں کو یہ والا پیغام نہیں دیتے تھے۔ہر نبی اور رسول ایک داعی تھا۔داعی الی اللہ کی زندگی اس طرح کی نہیں ہوسکتی۔بندوں کے درمیان رہنا،ان کی طرح بازاروں میں چلنا پھرنا،کھانا پینا،گھر گرہستی چلانا،کاروبار کرنا ان سب کا معمول رہا۔معجزے اگر عام انسانوں سے ہٹ کر دیئے گئے تو یہ بھی داعی کا ہتھیار تھے۔داعی جس حال میں ہو جس مقام پر ہو وہ اس فریضہ سے ہٹ کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔جب کسی بھی انسان کو اپنا''روزگار''نہ ملے تو وہ اس کی تلاش جاری رکھتا ہے۔اس کی حتمی ڈیوٹی لگ جاتی ہے جب اس کو روزگار مل جاتا ہے،چونکہ روزگار سے اس کی زندگی بچوں کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے اس لئے وہ اس ڈیوٹی کو پوری ذمہ داری سے احسن طریقہ پر ایمان داری کے ساتھ نبھاتا ہے۔

معیاری اور مطلوبہ''جاب''مل جانے سے پہلے وہ اپنی قابلیتوں کے سرٹیفکیٹ بغل میں دبائے دفتروں کے چکر لگاتا پھرتا ہے۔ہر متلاشی کو علم ہے کہ اس کی تعلیم وقابلیت کس''عہدے''کا تقاضا کرتی ہے۔کبھی ان پڑھ جاہل شخص کسی ادارے کے ڈائریکٹر کا امیدوار ہوکر انٹرویو دینے نہیں جاتا۔لیکن حالات کسی قابل ترین شخص کو ایک چپڑاسی بننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔مگر وہ اس کام سے اور جگہ سے کبھی خوش اور مطمئن نہیں ہوسکتا۔وہ اپنے لئے اپنی قابلیت کے مطابق عہدہ تلاش کرنے کی کوشش میں لگا رہے گا تا آنکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے۔

اسی طرح ہر طالب علم اپنی ایک خاص ڈگری کے حصول میں سالوں محنت کرتا ہے۔جب وہ ڈاکٹر،انجینئر یا پروفیسر بن جاتا ہے تو وہ دوبارہ سے سکول اور کالج میں داخلے کی طرف راغب نہیں ہوتا۔اگر کوئی ایسا سوچے یا اپنا ارادہ ظاہر کرے تو لوگ اس کی دماغی حالت پہ شبہ ظاہر کریں گے۔

اگر کسی کو یہ خبر ملے کہ آج سے آپ کو اس عہدے پر ترقی دی گئی ہے جس پر آپ سالوں بعد پہنچنے والے تھے،اور جہاں تک رسائی آپ کی قابلیت نے نہیں کروانی تھی۔یہ رسائی اس لئے ہوئی کہ سابقہ شخص بے ایمان،دھوکے باز غیر ذمہ دار اور ادارے سے بے وفائی کرنے والا تھا،تو خوشی کا سماں فوراً بدل جائے گا۔فکر وتشویش غالب آجائے گی۔ذمہ داریوں کا بوجھ اور سبکدوش ہونے والے شخص کا انجام بہت سے احساسات بدل دے گا اور اس عہدے کو نبھانے پر عزت کا تاج اور بے وفائی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے ذلت کے مناظر یاد آتے رہیں گے۔

مومن دنیا میں داعی الی اللہ کی حیثیت سے رہتا ہے۔یہی اس کا روزگار اور''جاب''ہے۔اسی کی تلاش اسے رہتی ہے اور یہی وہ''عہدہ''ہے جو اس کو'امت وسط' کا ممبر بناتا ہے اور مومن کا''ولی اللہ''ہونا اسی فریضے کو ادا کر لینا ہے۔اس عہدے کو ذمہ داری،امانت داری سے نبھانا ہی ہمارے اور ہمارے بچوں کے''مستقبل''کی ضمانت ہے۔جب اس ڈگری کو حاصل کرلیا تو پھر''جاہل''بننے کی کیا ضرورت ہے۔جب مطلوبہ ''جاب''مل گئی تو چھوٹی چھوٹی جگہوں پر اپنی قابلیتوں کے سرٹیفکیٹ

دکھانے اور مراعات حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک شاندار ''پیکیج'' ایک عظیم الشان ادارے (دنیا) کے مالک (اللہ تعالیٰ) نے دے رکھا ہےتو پھر چند سکوں والے پیکیج پہ غور وفکر کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ ولی اللہ ہونا پرندوں جیسا اڑنا یا برفانی جانوروں کی طرح چھ ماہ زندگی مفلوج کر لینے کا نام نہیں۔اللہ کا ولی وہ ہے جو کائنات کی ہر شے میں اپنے رب کی شانِ ربوبیت کو تسلیم کرلے۔ زندگی کے ہر مرحلے کو اللہ کے بندوں کی طرح گذارے اور لوگوں میں زندگی گزارتے ہوئے بھی اللہ کا بندہ بن کر رہے اور اللہ کے بندوں کو فیض پہنچائے اور ان بندوں کو ان کی ''جاب''ان کے''روزگار'' کے لئے مواقع فراہم کرے۔

سب سے بڑے اللہ کے بندے اپنی ''جاب'' کی تلاش میں غارِ حرا تک پہنچے جب مقصدِ حیات مل گیا تو کبھی غار میں واپس نہ گئے۔ جو مقصود تھا وہ مل گیا، جو ڈگری حاصل کرنا تھی مل گئی۔ جو عہدہ مالک نے عطا کرنا تھا کردیا، اب تو اس ڈگری (رسالت) اور اس عہدے (داعی) کو نبھانے کا امتحان تھا۔ جب میدانِ عمل مل گیا تو پھر غار میں بیٹھنے کا کیا کام؟ اور داعی ہر مقام پر داعی ہی رہتا ہے جب تک اس کی زندگی کا آخری سانس باقی ہے۔ وہ اگر غار میں واپس پلٹ کر نہیں جاتا، تو اس مقام سے پلٹ بھی آتا ہے جہاں جاتے ہوئے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔

غار کی تنہائی کا سکون ہو یا سدرۃ المنتہیٰ کی رونقیں، داعی اپنے میدانِ عمل سے غافل نہیں ہوتا۔ دونوں مقام داعی کے لئے راستہ ہیں منزل نہیں۔ منزل تو آخری سانس کی رخصتی سے وابستہ ہے۔

☆......☆......☆